ابتدا تیرے نام سے

محترم قارئین! سال 2011ء بہت سے سانحے، حادثے اور اہم واقعات اپنے دامن میں سمیٹے رخصت ہوا۔ اللہ کرے نیا سال ذاتی اور قومی زندگی میں ہر پہلو سے بہتری، سہولت اور خیر کا پیامبر ہو۔ آمین۔

؎ کتنے احباب کے چہروں میں ڈھلے، شام ڈھلے
وہ پرندے جو نہیں لوٹ سکے، شام ڈھلے
دھول اتنی نہ اڑا، یار ذرا آہستہ
کون یہ وقت کے لشکر سے کہے، شام ڈھلے

امارات سے جاری ہونے والی ایک رپورٹ کے مطابق امریکی سٹیٹ ڈیپارٹمنٹ پاکستانی ذرائع ابلاغ میں بھاری رقوم کی سرمایہ کاری کر رہا ہے۔ یہ سرمایہ کاری جو ظاہر اور خفیہ دونوں طریقوں سے ہو رہی ہے، پاکستانی عوام کے اندر امریکہ سے نفرت کو ختم کرنے اور اس کی جگہ مثبت جذبات ابھارنے کے لئے ہے۔ پاکستانی کیبل ٹی وی چینلوں کے مالکان کو بھاری تنخواہوں پر واشنگٹن میں اپنے نمائندگان مقرر کرنے کی پیش کش کی گئی ہے جن کے اخراجات سٹیٹ ڈیپارٹمنٹ کے ذمے ہوں گے۔ اس کے علاوہ نجی چینلوں کے نہایت مہنگے اور مصروف ترین اوقاتِ نشریات میں وائس آف امریکہ کے لئے مزید وقت خریدا جائے گا اور امریکہ کا امیج پاکستانی عوام میں بہتر کرنے کی کوشش کی جائے گی۔ آج کل ایف ایم ریڈیو پر بھی امریکی بچوں کی طرف سے پاکستانی عوام کے لئے خیر سگالی کے پیغامات نشر ہو رہے ہیں اور وائس آف امریکہ کے پہلے سے جاری پروگراموں میں امریکہ کی پاکستانی عوام سے ہمدردی وخلوص اور تعاون کی لگن کے دعوے کئے جاتے ہیں۔ اب اس نئی پیش کش کی بہتی گنگا میں سبھی چینل مالکان ہاتھ دھونے کو تیار بیٹھے ہیں۔ جس نفرت کی بنیاد تلخ ترین اور سنگین حقائق پر ہے، وہ خیر سگالی کے پیغامات اور محبت کی یقین دہانیوں سے کیسے دور ہو سکتی ہے۔ امریکہ اگر واقعی اس نفرت کو دور کرنا چاہتا ہے تو سب سے پہلے ہماری خود مختاری کو پامال کرنا بند کرے، پاکستانی عوام کی عزت اور جان و مال کو بھی اسی طرح قیمتی جانے جس طرح وہ اپنے شہریوں کی جان و مال اور عزت کو قیمتی سمجھتا ہے۔ پھر اس دہشت گردی کی جنگ میں باجوڑ کے 80 معصوم طالبعلموں سے لے کر وزیرستان، سوات اور کے پی میں ڈرون حملوں کا شکار ہونے والے ہر پاکستانی کی ہلاکت پر معافی مانگے اور ان کا خوں بہا ادا کرے۔ ریمنڈ ڈیوس اور اس جیسے دیگر سی آئی اے اور بلیک واٹر کے بدمعاشوں کے ہاتھوں جتنے پاکستانیوں کی جان و مال اور

عزت کونقصان پہنچا ہے ان سب کا ازالہ کرے۔ عافیہ صدیقی اوراس کے بچوں کے اغوااوران پرظلم وستم کا کفارہ ادا کرے اور اسے فوری رہائی دے کر پوری امتِ مسلمہ سے معافی مانگے۔ ہمارے حکمرانوں کو بلیک میل کرنا چھوڑے تا کہ وہ ملکی مفاد میں عوامی امنگوں کے مطابق فیصلے کرسکیں اور ایران اور چین سے معاہدات کے ذریعے توانائی کے بحران سے عوام کونجات دلواسکیں ۔ نیز ہمارے سمیت تمام مسلم معاشروں میں اپنا وہ مکروہ کردارادا کرنا بند کرے جس کی وجہ سے آج ہر چھوٹی بڑی مصیبت کے پیچھے امریکہ کا ہاتھ تلاش کیا جاتا ہے اور''جو کچھ ہورہا ہے، امریکہ کروارہا ہے'' کا فقرہ زبان زدِعام بن گیا ہے۔امریکہ کے اس کردار کی صرف ایک مثال یہاں درج ہے،

امریکی تھنک ٹینک''رینڈ کارپوریشن'' جوخاکم بدہن پاکستان کی سلامتی کیخلاف عزائم اور منصوبہ بندی پر کام کر چکا ہے، اپنی ایک رپورٹ میں اس نے بنیاد پرستوں اور سیاسی اسلام کے علمبرداروں کا زورتوڑنے کے لئے لائحہ عمل پیش کیا ہے جس کے مطابق تبدیلی کے لئے ضروری ہے کہ مسلم معاشروں میں جدیدیت زدہ (modern) طبقے کو پوری طرح اپنی حمایت سے نوازا جائے ،ان کے خیالات کی وسیع پیمانے پراشاعت وتبلیغ کی جائے اوران کی فکرکواسلامی نصابِ تعلیم کا حصہ بنایا جائے۔ نوجوان طبقے میں جدید اور ملحدانہ تہذیب کوفروغ دیا جائے تاکہ وہ اسلام پسندوں کے خیالات سے متاثر نہ ہوں ۔یہی حربہ مشرکین مکہ نے اس وقت استعمال کیا تھا جب نبی کریمؐ کی تبلیغ کے اثرات قریش کی ساری کوششوں کے باوجود پھیلنے سے نہ رُکے توانہوں نے ایران سے رستم واسفندیار کے قصے منگوا کر داستان گوئی کا سلسلہ شروع کیا،اورگانے بجانے والی لونڈیوں کا انتظام کیا تاکہ لوگ ان چیزوں میں مشغول ہوکر حضورؐ کی بات نہ سنیں ، ان کا یہ بھی منصوبہ ہے کہ بنیاد پرستوں کی اندرونی کمزوریوں کوابھارااوران کے آپس کے اختلافات کوہوادی جائے۔روایت پسند بنیاد پرستوں کے بنیاد پرستوں کی طرف جھکاؤ کو پھیلایا جائے جو کہ اسلام کی ایک کھلی ڈلی تعبیر پیش کرتا ہے۔رپورٹ کے مطابق یہ سب کچھ کرنے کی ضرورت اس لئے ہے کہ اسلام کی بعض تعبیرات سے پوری دنیا کا استحکام خطرے میں ہے۔

ایک طرف ایسی رپورٹیں ہیں جن کی بنیاد پرامریکہ ہر بنیاد پرستان ملک میں اپنے گھناؤنے عزائم خفیہ طریقے سے پورے کررہا ہےاور دوسری طرف وہ ہمارے عوام کو یہ باور کرانے پرمصر ہے کہ امریکہ ان کا کتنا بڑا خیرخواہ ہے۔درحقیقت اس دنیا کی سلامتی واستحکام کواگرخطرہ ہے تو صرف اورصرف امریکہ اوراس کے حواریوں کے جنگی جنون،مطلق العنانیت کےخواب اوراسلاموفوبیا سے ہے،جس نے کرۂ ارض کوجہنم زار بناڈالا ہے۔

سلالہ چوکی پر حملے کے بعد شمسی ائیربیس خالی کروالی گئی ہے اور نیٹو سپلائی لائن بھی بند کر دی گئی ہے ۔ ڈرون حملے روک دیئے گئے ہیں۔شاید اسی لئے خودکش حملوں کا سلسلہ بھی رک گیا ہے۔اللہ کرے کہ ہماری سیاسی وعسکری قیادت ان فیصلوں پر استقامت دکھائے اورقومی مفادات کو ہر چیز پرمقدم رکھے۔

اندرونِ خانہ، میمو کا معاملہ سپریم کورٹ میں جانے کے بعد حکومت اور فوج کی کشمکش عروج پر ہے۔ کئی طرح کی افواہیں گردش کرتی اور دم توڑتی رہیں۔ نااہل اور بدعنوان حکومت سے نجات جہاں سب کے دل کی آواز ہے، وہاں فوج کا کوئی ممکنہ سیاسی کردار بھی ناقابلِ قبول ہے۔ دعا ہے کہ یہ معاملہ صورتحال کی بہتری پر منتج ہو۔ اگلے ماہ تک اجازت دیجئے۔

دعا گو

صائمہ اسما

ایصال ثواب

وَاَنْ لَّیْسَ لِلاِ نْسَانِ اِلَّا مَاسَعٰی

اور یہ کہ انسان کے لئے کچھ نہیں ہے مگر وہ جس کی اُس نے سعی کی ہے (سورہ النجم)

اس ارشاد سے تین اہم اصول نکلتے ہیں۔ ایک یہ کہ ہر شخص جو کچھ بھی پائے گا اپنے عمل کا پھل پائے گا۔ دوسرے یہ کہ ایک شخص کے عمل کا پھل دوسرا نہیں پا سکتا، الا یہ کہ اُس عمل میں اُس کا اپنا کوئی حصہ ہو۔ تیسرے یہ کہ کوئی شخص سعی و عمل کے بغیر کچھ نہیں پا سکتا۔

ان تینوں اصولوں کو بعض لوگ دنیا کے معاشی معاملات پر غلط طریقے سے منطبق کر کے ان سے یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ کوئی شخص اپنی محنت کی کمائی (Earned income) کے سوا کسی چیز کا جائز مالک نہیں ہوسکتا۔ لیکن یہ بات قرآن مجید ہی کے دیئے ہوئے متعدد قوانین اور احکام سے ٹکراتی ہے۔ مثلاً قانون وراثت جس کی رو سے ایک شخص کے ترکے میں سے بہت سے افراد حصہ پاتے ہیں اور اس کے جائز وارث قرار پاتے ہیں دارانحالیکہ یہ میراث ان کی اپنی محنت کی کمائی نہیں ہوتی، بلکہ ایک شیر خوار بچے کے متعلق تو کسی کھینچ تان سے بھی یہ ثابت نہیں کیا جا سکتا کہ باپ کے چھوڑے ہوئے مال میں سے اس کی محنت کا بھی کوئی حصہ تھا۔ اسی طرح احکام زکوٰۃ وصدقات، جن کی رو سے ایک آدمی کا مال دوسروں کو محض ان کے شرعی و اخلاقی استحقاق کی بنا پر ملتا ہے اور وہ اس کے جائز مالک ہوتے ہیں، حالانکہ اس مال کے پیدا کرنے میں ان کی محنت کا کوئی حصہ نہیں ہوتا۔ اس لئے قرآن کی کسی ایک آیت کو لے کر اس سے ایسے نتائج نکالنا جو خود قرآن ہی کی دوسری تعلیمات سے متصادم ہوتے ہوں، قرآن کی منشاء کے بالکل خلاف ہے۔

بعض دوسرے لوگ ان اصولوں کو آخرت سے متعلق مان کر یہ سوالات اٹھاتے ہیں کہ آیا ان اصولوں کی رو سے ایک شخص کا عمل دوسرے شخص کے لئے کسی صورت میں بھی نافع ہوسکتا ہے؟ اور کیا ایک شخص اگر دوسرے شخص کے لئے یا اُس کے بدلے کوئی عمل کرے تو وہ اس کی طرف سے قبول کیا جا سکتا ہے؟ اور کیا یہ بھی ممکن ہے کہ ایک شخص اپنے عمل کے اجر کو دوسرے کی طرف منتقل کر سکے؟ ان سوالات کا جواب اگر نفی میں ہو تو ایصال ثواب اور حج بدل وغیرہ سب ناجائز ہو جاتے ہیں، بلکہ دوسرے کے حق میں دعائے استغفار بھی بے معنی ہو جاتی ہے، کیونکہ یہ دعا بھی اُس شخص کا اپنا عمل نہیں ہے جس کے حق میں دعا کی جائے۔ مگر یہ انتہائی نقطہ نظر معتزلہ کے سوا اہل اسلام میں سے کسی نے اختیار نہیں کیا ہے۔ صرف وہ اس آیت کا یہ مطلب لیتے ہیں کہ ایک شخص کی سعی

دوسرے کے لئے کسی حال میں بھی نافع نہیں ہوسکتی ۔ بخلاف اس کے اہل سنت ایک شخص کے لئے دوسرے کی دعا کے نافع ہونے کوتو بالاتفاق مانتے ہیں، کیونکہ وہ قرآن سے ثابت ہے، البتہ ایصال ثواب تاور نیابتہً دوسرے کی طرف سے کسی نیک کام کے نافع ہونے میں ان کے درمیان اصولاً نہیں بلکہ صرف تفصیلات میں اختلاف ہے۔

(ا) ایصالِ ثواب یہ ہے کہ ایک شخص کوئی نیک عمل کر کے اللہ سے دعا کرے کہ اس کا اجر وثواب کسی دوسرے شخص کو عطا فرمادیا جائے۔اس مسئلے میں امام مالکؒ اور امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ خالص بدنی عبادات، مثلاً نماز، روزہ اور تلاوتِ قرآن وغیرہ کا ثواب دوسرے کو نہیں پہنچ سکتا ،البتہ مالی عبادات، مثلاً صدقہ، یا مالی و بدنی مرکب عبادات ،مثلاً حج کا ثواب دوسرے کو پہنچ سکتا ہے، کیونکہ اصل یہ ہے کہ ایک شخص کا عمل دوسرے کے لئے نافع نہ ہو، مگر چونکہ احادیثِ صحیحہ کی رُو سے صدقہ کا ثواب پہنچایا جاسکتا ہے اور حج بدل بھی کیا جاسکتا ہے، اس لئے ہم اسی نوعیت کی عبادات تک ایصالِ ثوا بکی صحت تسلیم کرتے ہیں ۔بخلاف اس کے حنفیہ کا مسلک یہ ہے کہ انسان اپنے ہر نیک عمل کا ثواب دوسرے کو بہ کرسکتا ہے خواہ وہ نماز ہو یا روزہ یا تلاوت قرآن یا ذکر یا صدقہ یا حج وعمرہ ساس کی دلیل یہ ہے کہ آدمی جس طرح مزدوری کر کے مالک سے یہ کہ سکتا ہے کہ اس کی اجرت میرے بجائے فلاح شخص کو دے دی جائے ، اسی طرح وہ کوئی نیک عمل کر کے اللہ تعالیٰ سے یہ دعا بھی کرسکتا ہے کہ اس کا اجر میری طرف سے فلاں شخص کو عطا کر دیا جائے۔اس میں بعض اقسام کی نیکیوں کو مستثنیٰ کرنے اور بعض دوسری اقسام کی نیکیوں تک اسے محدود رکھنے کی کوئی معقول وجہ نہیں ہے۔یہی بات بکثرت احادیث سے بھی ثابت ہے ۔

بخاری، مسلم، مسند احمد، ابن ماجہ، طبرانی (فی الاوسط) مستدرک اور ابن ابی شیبہ میں حضرت عائشہ، حضرت ابو ہزیرہ، حضرت جابر بن عبداللہ، حضرت ابو رافع، حضرت ابو طلحہ انصار یاور حذیفہ بن اُسید الفغاریؓ کی متفقہ روایت ہے کہ رسول ﷺ نے دومینڈھے لے کر ایک اپنی اور اپنے گھر والوں کی طرف سے قربان کیا اور دوسرا اپنی امت کی طرف سے۔

مسلم، بخاری، مسند احمد، ابوداؤد اور نسائی میں حضرت عائشہ کی روایت ہے کہ ایک شخص نے رسول ﷺ سے عرض کیا کہ میری ماں کا اچانک انتقال ہوگیا ہے میرا خیال ہے کہ اگر انہیں بات کرنے کا موقع ملتا تو وہ ضرور صدقہ کرنے کے لئے کہتیں۔اب اگر میں ان کی طرف سے صدقہ کروں تو کیا ان کے لئے اجر ہے؟ فرمایاہاں۔

مسند احمد میں حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص کی روایت ہے کہ ان کے دادا عاص بن وائل نے زمانہ جاہلیت میں سواونٹ ذبح کرنے کی نذر مانی تھی۔ان کے چچا ہشام بن العاص نے اپنے حصے کے پچاس اونٹ ذبح کر دیئے۔ حضرت عمرو بن العاص نے رسول ﷺ سے پوچھا کہ میں کیا کروں۔حضورؐ نے فرمایا اگر تمہارے باپ نے توحید کا اقرار کرایا تھا تو تم ان کی طرف سے روزہ رکھو یا صدقہ کرو، وہ ان

کے لئے نافع ہوگا۔

مسند احمد، ابوداؤد، نسائی اور ابن ماجہ میں حضرت حسن بصری کی روایت ہے کہ حضرت سعد بن عبادہؓ نے رسول ﷺ سے پوچھا کہ میری والدہ کا انتقال ہوگیا ہے، کیا میں ان کی طرف سے صدقہ کروں؟ آپؐ نے فرمایا ہاں۔ اسی مضمون کی متعدد دوسری روایات بھی حضرت عائشہؓ، حضرت ابوہریرہؓ اور حضرت ابن عباسؓ سے بخاری، مسلم، مسند احمد، نسائی، ترمذی، ابوداؤد اور ابن ماجہ وغیرہ میں موجود ہیں جن میں رسول ﷺ نے میت کی طرف سے صدقہ کرنے کی اجازت دی ہے اور اسے میت کے لئے نافع بتایا ہے۔

دار قُطنی میں ہے کہ ایک شخص نے حضورؐ سے عرض کیا میں اپنے والدین کی خدمت ان کی زندگی میں تو کرتا ہوں، ان کے مرنے کے بعد کیسے کروں؟ فرمایا ''یہ بھی ان کی خدمت ہی ہے کہ ان کے مرنے کے بعد تو اپنی نماز کے ساتھ ان کے لئے بھی نماز پڑھے اور اپنے روزوں کے ساتھ ان کے لئے بھی روزے رکھے۔'' ایک دوسری روایت دار قطنی میں حضرت علیؓ سے مروی ہے جس میں وہ بیان کرتے ہیں کہ حضورؐ نے فرمایا جس شخص کا قبرستان پر گزر ہوا اور وہ گیارہ مرتبہ قل ھواللہ احمد پڑھ کر اس کا اجر مرنے والے کو بخش دے تو جتنے مردے ہیں اتنا ہی اجر عطا کر دیا جائے گا۔

یہ کثیر روایات جو ایک دوسری کی تائید کر رہی ہیں، اس امر کی تصریح کرتی ہیں کہ ایصال ثواب نہ صرف ممکن ہے، بلکہ ہر طرح کی عبادات اور نیکیوں کے ثواب کا ایصال ہوسکتا ہے اور اس میں کسی خاص نوعیت کے اعمال کی تخصیص نہیں ہے۔ مگر اس سلسلے میں چار باتیں اچھی طرح سمجھ لینی چاہیں:

ایک یہ کہ ایصال اُسی عمل کے ثواب کا ہوسکتا ہے جو خالصتاً اللہ کے لئے اور قواعدِ شریعت کے مطابق کیا گیا ہو، ورنہ ظاہر ہے کہ غیر اللہ کے لئے یا شریعت کے خلاف جو عمل کیا جائے اس پر خود عمل کرنے والے ہی کو کسی قسم کا ثواب نہیں مل سکتا، کجا کہ وہ کسی دوسرے کی طرف منتقل ہو سکے۔

دوسری بات یہ ہے کہ جو لوگ اللہ تعالیٰ کے ہاں صالحین کی حیثیت سے معمان ہیں اُن کو تو ثواب کا ہدیہ یقیناً پہنچے گا مگر جو وہاں مجرم کی حیثیت سے حوالات میں بند ہیں انہیں کوئی ثواب پہنچنا متوقع نہیں ہے۔ اللہ کے معمانوں کو ہدیہ تو پہنچ سکتا ہے، مگر امید نہیں کہ اللہ کے مجرم کو تحفہ پہنچ سکے۔ اُس کے لئے اگر کوئی شخص کسی غلط فہمی کی بنا پر ایصال ثواب کرے گا تو اس کا ثواب ضائع نہ ہوگا بلکہ مجرم کو پہنچنے کی بجائے اصل عامل ہی کی طرف پلٹ آئے گا۔ جیسے منی آرڈر اگر مُرسل الیہ کو نہ پہنچے تو مُرسل کو واپس مل جاتا ہے۔

تیسری بات یہ ہے کہ ایصالِ ثواب تو ممکن ہے مگر ایصال عذاب ممکن نہیں ہے۔ یعنی یہ تو ہوسکتا ہے کہ آدمی نیکی کر کے کسی دوسرے کے لئے اجر بخش دے اور وہ اس کو پہنچ جائے مگر یہ نہیں ہوسکتا کہ آدمی گناہ کر کے اس کا عذاب کسی کو بخشے اور وہ اسے پہنچ جائے۔

اور چوتھی بات یہ ہے کہ نیک عمل کے دو فائدے ہیں۔ ایک اس کے وہ نتائج جو عمل کرنے والے کی اپنی روح اور اس کے اخلاق پر مترتب ہوتے ہیں اور جن کی بنا پر وہ اللہ کے ہاں بھی جزا کا مستحق ہوتا ہے۔ دوسرے اس کا وہ اجر جو

اللہ تعالیٰ بطور انعام اسے دیتا ہے ایصال ثواب کا تعلق پہلی چیز سے نہیں ہے بلکہ صرف دوسری چیز سے ہے۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے ایک شخص ورزش کر کے کشتی کے فن میں مہارت حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس سے جو طاقت اور مہارت اس میں پیدا ہوتی ہے وہ بہر حال اس کی ذات ہی کے لئے مخصوص ہے۔ دوسرے کی طرف وہ منتقل نہیں ہو سکتی۔ اس طرح اگر وہ کسی دربار کا ملازم ہے اور پہلوان کی حیثیت سے اس کے لئے ایک تنخواہ مقرر ہے تو وہ بھی اس کو ملے گی، کسی اور کو نہ دے دی جائے گی۔ البتہ جو انعامات اس کی کارکردگی پر خوش ہو کر اس کا سرپرست اسے دے اس کے حق میں وہ درخواست کر سکتا ہے کہ وہ اس کے استاد، یا ماں باپ، یا دوسرے محسنوں کو اُس کی طرف سے دے دیئے جائیں۔ ایسا ہی معاملہ اعمالِ حسنہ کا ہے کہ ان کے روحانی فوائد قابلِ انتقال نہیں ہیں، اور ان کی جزا بھی کسی کو منتقل نہیں ہو سکتی، مگر ان کے اجر و ثواب کے متعلق وہ اللہ تعالیٰ سے دعا کر سکتا ہے کہ وہ اس کے کسی عزیز قریب یا اس کے کسی محسن کو عطا کر دیا جائے۔ اسی لئے اس کو ایصال جزا نہیں بلکہ ایصال ثواب کہا جاتا ہے۔

(۲) ایک شخص کی سعی کے کسی اور شخص کے لئے نافع ہونے کی دوسری شکل یہ ہے کہ آدمی یا تو دوسرے کی خواہش اور ایماء کی بنا پر اس کے لئے کوئی نیک عمل کرے، یا اس کی خواہش اور ایماء کے بغیر اُس کی طرف سے کوئی ایسا عمل کرے جو دراصل واجب تو اُس کے ذمہ تھا مگر وہ خود اسے ادا نہ کر سکا۔ اس کے بارے میں فقہاء حنفیہ کہتے ہیں کہ عبادات کی تین قسمیں ہیں۔ ایک خالص بدنی، جیسے نماز، دوسری خالص مالی، جیسے زکوٰۃ اور تیسری مالی و بدنی مرکب، جیسے حج ان میں سے پہلی قسم میں نیابت نہیں چل سکتی، مثلاً ایک شخص کی طرف سے دوسرا شخص نیابتاً نماز نہیں پڑھ سکتا۔ دوسری قسم میں نیابت ہو سکتی ہے، مثلاً بیوی کے زیورات کی زکوٰۃ شوہر دے سکتا ہے۔ تیسری قسم میں نیابت صرف اُس حالت میں ہو سکتی ہے جبکہ اصل شخص، جسکی طرف سے کوئی فعل کیا جا رہا ہے، اپنا فریضہ خود ادا کرنے سے عارضی طور پر نہیں بلکہ مستقل طور پر عاجز ہو۔

مثلاً حج بدل ایسے شخص کی طرف سے ہو سکتا ہے جو خود حج کے لئے جانے پر قادر نہ ہو اور نہ یہ امید ہو کہ وہ کبھی اس کے قابل ہو سکے گا۔ مالکیہ اور شافعیہ بھی اس کے قائل ہیں۔ البتہ امام مالک حج بدل کے لئے یہ شرط لگاتے ہیں کہ اگر باپ نے وصیت کی ہو کہ اُس کا بیٹا اس کے بعد اُس کی طرف سے حج کرے تو وہ حج بدل کر سکتا ہے ورنہ نہیں۔ مگر احادیث اس معاملہ میں بالکل صاف ہیں کہ باپ کا ایما یا وصیت ہو یا نہ ہو، بیٹا اس کی طرف سے حج بدل کر سکتا ہے۔

ان احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ بدنی عبادات میں بھی نیابت جائز ہے۔ مگر امام ابوحنیفہ، امام مالک اور امام شافعی اور امام زید بن علی کا فتویٰ یہ ہے کہ میت کی طرف سے روزہ نہیں رکھا جا سکتا، اور امام احمد، امام لیث اور اسحاق بن راہویہ کہتے ہیں کہ صرف اُس صورت میں ایسا کیا جا سکتا ہے جبکہ مرنے والے نے اس کی نذر مانی ہو اور وہ اسے پورا نہ کر سکا ہو۔ مانعین کا استدلال یہ ہے کہ جن احادیث سے اس

کے جواز کا ثبوت ملتا ہے اُن کے راویوں نے خود اس کے خلاف فتویٰ دیا ہے ابن عباس کا فتویٰ نسائیؒ نے ان الفاظ میں نقل کیا ہے کہ **لا یصل احد عن احد ولا یصم احد عن احد** ''کوئی شخص کسی کی طرف سے نہ نماز پڑھے اور نہ روزہ رکھے۔'' اور حضرت عائشہؓ کا فتویٰ عبدالرزاق کی روایت کے مطابق یہ ہے کہ **لاتضو لو عن موتکم و اطمعو ا عنھم** ''اپنے مردوں کی طرف سے روزہ نہ رکھو بلکہ کھانا کھلاؤ۔'' حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے بھی عبدالرزاق نے یہی بات نقل کی ہے کہ میت کی طرف سے روزہ نہ رکھا جائے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ابتداً بدنی عبادات میں نیابت کی اجازت تھی، مگر آخری حکم یہی قرار پایا کہ ایسا کرنا جائز نہیں ہے۔ ورنہ کس طرح ممکن تھا کہ جنہوں نے رسول ﷺ سے یہ احادیث نقل کی ہیں وہ خود اُن کے خلاف فتویٰ دیتے۔

اس سلسلے میں یہ بات اچھی طرح سمجھ لینی چاہیے کہ نیابتاً کسی فریضہ کی ادائیگی صرف اُنہی لوگوں کے حق میں مفید ہو سکتی ہے جو خود ادائے فرض کے خواہشمند ہوں اور معذوری کی وجہ سے قاصر رہ گئے ہوں۔ لیکن اگر کوئی شخص استطاعت کے باوجود قصداً حج سے مجتنب رہا اور اُس کے دل میں اس فرض کا احساس تک نہ تھا، اُس کے لئے خواہ کتنے ہی حج بدل کئے جائیں، وہ اس کے حق میں مفد نہیں ہو سکتے۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے ایک شخص نے کسی کا قرض جان بوجھ کر مار کھایا اور مرتے دم تک اس کا کوئی ارادہ قرض ادا کرنے کا نہ تھا۔ اس کی طرف سے خواہ بعد میں پائی پائی ادا کر دی جائے، اللہ تعالیٰ کی نگاہ میں وہ قرض مارنے والا ہی شمار ہوگا۔ دوسرے یہ کہ ادا کرنے سے سبکدوش صرف وہی شخص ہوسکتا ہے جو اپنی زندگی میں ادائے قرض کا خواہشمند ہو اور کسی مجبوری کی وجہ سے ادا نہ کر سکا ہو۔

(تفہیم القرآن سورہ نجم حاشیہ 38)

سراجِ مُنیر

حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ رسولؐ اللہ کا گذر بکری کے ایک مردہ بچے پر ہوا جو راستے میں مرا پڑھا تھا، اُس وقت آپؐ کے ساتھ جو لوگ تھے ان سے آپؐ نے فرمایا: تم میں سے کوئی اس مرے ہوئے بچے کو ایک درہم میں خریدنا پسند کرے گا ؟ انہوں نے عرض کیا ہم تو اس کو کسی قیمت پر بھی خریدنا پسند نہیں کریں گے۔ آپؐ نے فرمایا: قسم ہے خدا کی کہ دنیا اللہ کے نزدیک اس سے زیادہ ذلیل اور بے قیمت ہے جتنا ذلیل اور بے قیمت تمہارے نزدیک یہ مردار بچہ ہے۔ (صحیح مسلم)

بڑے ہی محروم اور بہت ہی گھاٹے میں رہنے والے ہیں وہ لوگ جو دنیا کو حاصل کرنے کے لئے تو خوب جدوجہد کرتے ہیں مگر آخرت کی تیاری کی طرف بے فکر اور بے پرواہ ہیں۔ انسان کی کامیابی اسی میں ہے کہ آخرت کو اپنی اصل منزل اور اپنا دوامی وطن یقین کرتے ہوئے وہاں کی کامیابی حاصل کرنے کی فکر کو اپنی تمام دنیوی فکروں پر غالب رکھے دنیا کے جن کاموں سے آخرت کا راستہ کھوٹا نہ ہو تو وہ قابلِ مذمت نہیں بلکہ وہ تو جنت تک پہنچنے کا زینہ ہیں۔

(۲) حضرت ابو ہریرہؓ بیان کرتے ہیں کہ رسولؐ اللہ نے فرمایا: جس نے میری امت میں فساد کے زمانے میں میری سنت کو مضبوطی سے تھاما اس کے لئے سو شہیدوں کا ثواب ہے۔ (البیہقی بحوالہ مشکوٰۃ)

اُمت کا فساد کیا ہے؟ اللہ کی طرف سے ہدایت کی نعمت کی ناشکری اور اس سے غفلت، اس سے بے وفائی، اپنے مقام اور مشن کو فراموش کر دینا، بے عملی اور بے یقینی، گناہ اور نافرمانی کا عام ہونا، باہم خونریزی اور ظلم و جبر جو غیر قوموں کا تسلط اور اُن کی غلامی، ان حالات میں سنتِ رسولؐ پر قائم رہنے والے سے اجرِ عظیم کا وعدہ ہے۔ ہر سنت کا اتباع ضروری ہے لیکن حضورؐ کی سب سے اہم سنت اللہ کے دین اور ہدایت کی طرف دعوت کا کام، جہاد اور اللہ کی راہ میں خرچ کرنا ہے جس میں آپؐ ہر دم اور ہر قدم مشغول رہے اور ان کے ساتھ زادِ راہ کے طور پر اخلاقِ حسنہ اور عباداتِ الٰہی ہیں۔

(۳) نبیؐ نے فرمایا: جس کسی نے بھی لوگوں کو کسی نیکی کی طرف بلایا تو ایسے شخص کو ان تمام لوگوں کے برابر اجر و ثواب ملے گا جو اس نیکی پر عمل کریں گے اور اُس سے نیکی پر عمل کرنے والوں کے اجر و ثواب میں کوئی کمی نہ ہوگی اور جس کسی نے لوگوں کو کسی برائی اور گمراہی کی طرف بلایا تو اُس آدمی کو اُن تمام لوگوں کے برابر سزا دی جائے گی جو اُس برائی میں مبتلا ہوں گے اور اُس سے برائی کرنے والوں کی سزا میں کوئی تخفیف نہ ہوگی (مسلم)

یہ حدیث مومن کو جھنجھوڑتی ہے کہ وہ ہر وقت چوکنّا رہے اور غفلت کی زندگی نہ گزارے کیونکہ اگر کوئی ایک برائی بھی خدانخواستہ اس کی ذات سے پھیل گئی تو اس کی سزا بڑھتے بڑھتے اتنی ہوسکتی ہے کہ سارا اعمال نامہ سیاہ ہو جائے گا۔

سب سے نفع بخش کاروبار دعوت و اصلاح کا کاروبار ہے۔ اپنی نیکیاں موت کے ساتھ ختم ہو جائیں گی دعوت و اصلاح کے شعبے میں لوگ جو نیکیاں کریں گے اُن کا بھی اجر اُس وقت تک ملتا رہے گا جب تک وہ ہوتی رہیں گی، ذرا اس بے حد و حساب اجر کا تصور کیجئے اور ساتھ اپنی کوتاہی پر ماتم بھی۔

(۴) حضرت ابو ہریرہؓ بیان کرتے ہیں: ایک دن رسولؐ اللہ نے پوچھا کیا تم جانتے ہو مفلس کون ہے؟ صحابہؓ نے عرض کیا ہمارے نزدیک مفلس وہ ہے جس کے پاس مال ہو نہ اسباب آپؐ نے فرمایا: میری اُمت میں تو مفلس وہ ہے جو قیامت کے روز ڈھیر ساری نمازیں، روزے اور زکوٰتیں لے کر آئے گا مگر ساتھ ہی اس حال میں آئے گا کہ کسی کو گالی دی، کسی پر تہمت لگائی، کسی کا مال کھایا، کسی کا خون بہایا، کسی کو مارا پس (ان مظالم کے قصاصی میں) اس دعوے دار کو اس کی نیکیاں دے دی جائیں گی، یہاں تک کہ اگر حساب پورا ہونے سے پہلے اُس کی نیکیاں ختم ہوگئیں تو ان (دعوے داروں) کے گناہ لے کر اُس پر ڈال دیئے جائیں گے اور پھر وہ سر کے بل آگ میں ڈال دیا جائے گا۔ (مسلم)

اس حدیث میں بندوں کے حقوق سے لاپروائی اور ان پر ظلم و زیادتی کے ہولناک انجام کی نہایت ہی عبرت انگیز انداز میں تصویر کشی کی گئی ہے قیامت کے روز ہر حق اور ہر ظلم کا حساب اور بدلہ ہوگا وہاں انسانوں کی حق تلفیوں کی تلافی صرف اعمال کی کرنسی ہی سے ہو سکے گی۔ جس کسی نے بھی کسی کی حق تلفی کی ہو اُسے چاہیے کہ آج ہی مظلوم کا حق ادا کرے یا اُس سے معافی مانگ لے اور دنیاوی رسوائی کا خیال نہ کرے کیونکہ روزِ محشر کی رسوائی دنیا کی رسوائی سے کہیں زیادہ سخت اور عبرتناک ہوگی۔

(۵) رسولؐ اللہ نے فرمایا: جس نے پاک کمائی سے ایک کھجور کے برابر بھی خیرات کی اللہ اُسے اپنے دائیں ہاتھ میں قبول فرماتا ہے اور اللہ تو صرف پاک (چیز) ہی قبول کرتا ہے۔ پھر وہ اس کو خیرات کرنے والے کے لئے پالتا رہتا ہے جیسے تم میں سے کوئی اپنے بچھڑے کو پالتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ خیرات پہاڑ کے برابر ہو جاتی ہے (بخاری)

دنیا میں انسان مستقبل کی اہم ضروریات کے لئے پیسہ جمع کرتا ہے کہ ضرورت کے وقت تنگی نہ ہو آخرت میں تو سخت حاجت اور انتہائی مجبوری کا وقت ہوگا وہاں نہ قرض لیا جا سکے گا اور نہ رشتہ داریاں کام آئیں گی۔ ایسے اہم کٹھن وقت کیلئے جتنا انسان کے بس میں ہو جمع کرتے رہنا انتہائی دانشمندی اور دور اندیشی کی بات ہے۔ یہاں انسان تھوڑا تھوڑا کر کے آگے بھیجتا رہے گا تو اُسے کسی دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا اور وہاں مہربان خدا پہاڑوں کے برابر کر کے لوٹا دے گا۔

(۶) رسولؐ اللہ نے فرمایا: میری امت کے سارے ہی

لوگ جنت میں جائیں گے سوائے اُن کے جو انکار کریں'' پوچھا گیا'' انکار کرنے والا کون ہے؟ ارشاد فرمایا'' جس نے میری اطاعت کی وہ جنت میں جائے گا اور جس نے میری نا فرمانی کی تو حقیقت میں اُس نے انکار کیا'' (بخاری)

یہ بات ہم سب کے لئے غور طلب ہے کہ جس رسولؐ پر ایمان کو ہم اپنی زندگی کا اصل سرمایہ سمجھتے ہیں کیا اُن کے ساتھ وفاداری کا حق بھی ادا کرتے ہیں؟ ایمان و اسلام اس کے سوا کچھ نہیں کہ ہماری پوری زندگی زیادہ سے زیادہ سیرتِ رسولؐ کے مطابق ہو۔ اگر ہم آپؐ کے بعض احکام پر عمل کریں گے اور بعض کو رد کریں گے تو یہ اطاعت رسولؐ کے بجائے شقاقِ رسول (رسول کی مخالفت) ہے اور قرآن (النساء۱۱۵) گواہ ہے کہ جو لوگ اس جرم عظیم کے مرتکب ہیں اُن کا ٹھکانہ جہنم ہے۔

(۷) رسولؐ اللہ نے فرمایا: خدائے بلند و برتر نے جبرئیلؑ کو حکم دیا کہ اس بستی کو الٹ دو۔ جبرئیلؑ نے کہا پرور دگار اُن میں تو تیرا ایک نیک بندہ ہے جس نے پلک جھپکانے کی حد تک بھی کبھی تیری نا فرمانی نہیں کی ہے۔ پروردگار نے فرمایا جبرئیلؑ بستی کو اُس پر بھی الٹ دو اور دوسروں پر بھی اس لئے کہ (ان بستیوں میں علی الاعلان میری نا فرمانی ہوتی رہی اور) اُس کے ماتھے پر شکن تک نہیں آئی (مشکوٰۃ)

مسلمان کی غیرت ایمان احکامِ الٰہی کی کھلم کھلا بے حرمتی کو برداشت نہیں کر سکتی۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہی وہ فریضہ ہے جس سے کسی بھی معاشرے میں دین کا تحفظ ممکن ہے۔ جس معاشرے میں لوگ ایک دوسرے کو برائیوں سے روک کر نیکیوں کی ترغیب نہ دیتے رہیں وہاں آہستہ آہستہ برائی کو برا جاننے ہی کی حس ختم ہو جاتی ہے برائیوں سے عدم تعرضی کے نتیجے میں دنیا میں بدی کی اشاعت ہوتی ہے اور مختلف قسم کے فساد رونما ہوتے ہیں اور علاقے تباہ ہوتے ہیں ایسے میں صرف وہی لوگ مبتلائے مصیبت نہیں ہوتے جنہوں نے برائیاں کیں بلکہ وہ نیکوکار بھی تباہ ہو جاتے ہیں جو برائیوں کو روکنے کی کوشش نہیں کرتے قرآن گواہ ہے کہ سنت کے احکام کی خلاف ورزی کرنے والے ہی نہیں بلکہ گناہوں کو خاموشی سے برداشت کرنے والے بھی عذابِ الٰہی سے نہ بچ سکے (الاعراف: ۱۶۵)

(۸) نبی رحمتؐ نے فرمایا: ''جو نیک اولاد بھی والدین پر محبت بھری نظر ڈالتی ہے اُس کے بدلے خدا اُس کا ایک حج مقبول کا ثواب بخشتا ہے'' لوگوں نے پوچھا اے خدا کے رسولؐ اگر کوئی ایک دن میں سو بار اسی طرح رحمت و محبت کی نظر ڈالے فرمایا جی ہاں اگر کوئی سو بار ایسا کرے تب بھی خدا تمہارے تصور سے بہت بڑا اور تنگ دلی جیسے عیبوں سے بالکل پاک ہے (مسلم)

خدا کے بعد ہمارے سب سے بڑے محسن ہمارے والدین ہیں وہ جس بے مثل جانفشانی اور انتہائی شفقت سے ہماری سرپرستی کرتے ہیں اُس کا تقاضا ہے کہ ہمارا سینہ اُن کی عقیدت مندی اور عظمت و محبت سے سرشار ہو ماں باپ کی خدمت ہی سے دونوں جہانوں کی بھلائی، سعادت اور عظمت حاصل ہوتی ہے۔ اُن سے حسنِ سلوک جنت کی

ضمانت ہے نبیؐ نے تو خدمتِ والدین کو جہاد جیسی عظیم عبادت پر بھی ترجیح دی ہے۔

(۹) ایک دفعہ امام حسینؓ نے حضرت علیؓ سے حضورؐ کے اخلاق و عادات کی نسبت سوال کیا تو حضرت علیؓ نے آپؐ کا اخلاق بیان کرتے ہوئے فرمایا: آپؐ خندہ جبین، نرم خو مہربان طبع تھے۔ سخت مزاج اور تنگ دل نہ تھے، بات بات پر شور نہیں کرتے تھے۔ کوئی برا کلمہ منہ سے کبھی نہیں نکالتے تھے۔ عیب جو اور سخت گیر نہ تھے کوئی ایسی بات ہوتی جو آپؐ کو نا پسند ہوتی تو اس سے اغماض فرماتے تھے۔ کوئی آپؐ سے کچھ امید رکھتا تو نہ اُس کو مایوس کرتے تھے اور نہ منظوری ظاہر فرماتے تھے اپنے نفس سے تین چیزیں آپؐ نے بالکل دور کر دی تھیں۔ بحث و مباحثہ، ضرورت سے زیادہ بات کرنا اور جو بات مطلب کی نہ ہو اُس میں پڑنا دوسروں کے متعلق بھی تین باتوں سے پرہیز کرتے تھے کسی کو برا نہیں کہتے، کسی کی عیب گیری نہیں کرتے، کسی کے اندرونی حالات کی ٹوہ میں نہیں رہتے وہی باتیں کرتے جن سے کوئی مفید نتیجہ نکل سکتا تھا۔ جب آپؐ کلام کرتے صحابہؓ اس طرح خاموش ہو کر اور سر جھکا کر سنتے گویا اُن کے سروں پر پرندے بیٹھے ہیں۔ جب آپؐ چپ ہو جاتے تو پھر وہ آپس میں بات چیت کرتے کوئی دوسرا بات کرتا تو جب تک وہ بات ختم نہ کر لیتا چپ سنا کرتے۔ لوگ جن باتوں پر ہنستے آپؐ تبسم فرماتے دوسروں کے منہ سے اپنی تعریف سننا پسند نہیں فرماتے تھے، لیکن اگر کوئی آپؐ کے احسان و انعام کا شکریہ ادا کرتا تو قبول فرماتے۔ جب تک بولنے والا خود چپ نہ ہو جاتا، آپؐ اُس کی بات درمیان سے نہیں کاٹتے تھے نہایت فیاض، راست گو، نرم طبع اور خوش طبیعت تھے۔ اگر کوئی دفعتاً آپؐ کو دیکھتا تو مرعوب ہو جاتا، لیکن جیسے جیسے آشنا ہوتا جاتا آپؐ سے محبت کرنے لگتا (شمائل ترمذی)

(۱۰) ایک دفعہ رسولؐ اللہ نے پوچھا! تم میں سے کون ہے جس کو اپنا مال اپنے وارث کے مال سے زیادہ محبوب ہے؟ لوگوں نے عرض کیا یا رسولؐ اللہ ہم میں سے کوئی بھی ایسا نہیں ہے جسے اپنا مال وارث کے مال سے زیادہ محبوب نہ ہو۔ فرمایا ''سوچ لو کہ تم کیا کہہ رہے ہو'' لوگوں نے عرض کیا یا رسولؐ اللہ ہمارا حال واقعی یہی ہے اس پر حضورؐ نے فرمایا: ''تمہارا اپنا مال تو وہ ہے جو تم نے اپنی آخرت کے لئے آگے بھیج دیا اور جو کچھ تم نے روک کر رکھا وہ تو وارث کا مال ہے'' (بخاری۔ نسائی، مند ابو یعلی)

دنیا پرستوں کی نگاہ میں یہ بڑی عقلمندی ہے کہ انسان پیسہ جوڑ جوڑ کر رکھے اور اپنی ذاتی ضروریات کے علاوہ ایک پائی بھی ہاتھ سے نہ جانے دے جبکہ اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ زائد از ضرورت مال کو دل کھول کر اللہ کی راہ میں خرچ کیا جائے عیش و عشرت کے حصول اور معاشرے میں وقار قائم رکھنے کے لئے پیسہ خرچ کرنا معمولِ زندگی بن چکا ہے ورنہ انسان کی حقیقی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے بہت کم چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے حقیقی دانشمندی یہی ہے کہ اس فانی ساز و سامان کو اللہ کی راہ میں خرچ کر کے ہمیشگی کی زندگی کے لئے آرام و راحت کا ذریعہ بنا لیا جائے۔

☆☆☆

امجد عباسی

استحکام خاندان پر کاری ضرب

بظاہر اس خدشے سے کہ وسائل کم پڑ رہے ہیں اور آبادی بڑھ رہی ہے، کہیں ایسا نہ ہو کہ آگے چل کر انسان فاقہ کشی پر مجبور ہو جائے مالتھس نے تحدید آبادی، یعنی آبادی گھٹانے اور خاندانی منصوبہ بندی کا فلسفہ پیش کیا اور بتدریج مغرب نے اس نظریے کو اپنا لیا۔ آج ۲۱ ویں صدی میں اس نظریے کو اپنانے کے نتائج و اثرات کا جائزہ لیا جائے تو غور و فکر کے کئی پہلو سامنے آتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ آج وسائل ماضی سے بدرجہا زیادہ بلکہ انسانی ضروریات سے فاضل ہیں اور دوسری طرف مغرب میں شرح پیدائش میں اتنی کمی واقع ہو چکی ہے کہ بعض ممالک کو نسلی بقا کا مسئلہ درپیش ہے۔ حقائق اس نظریے کو نہ صرف غلط ثابت کرتے ہیں بلکہ بحیثیت مجموعی انسانی معاشرے کی تباہی کا باعث ٹھہراتے ہیں۔ سرِ دست خاندان کے استحکام پر اس کے مضر اثرات کا مختصراً جائزہ پیش نظر ہے

۔

انسانی تمدن اور معاشرت کی بنیاد خاندان ہے جس کا آغاز ایک مرد اور عورت کے رشتہ ازدواج میں منسلک ہونے سے ہوتا ہے بچوں کی پیدائش سے یہ رشتہ نہ صرف مضبوط ہوتا ہے بلکہ نسلی بقا کے ساتھ ساتھ خاندان کو استحکام بھی ملتا ہے ۔انسان کی فطری خواہش بھی اپنی نسل کی بقا اور تسلسل ہے۔ اس فطری خواہش پر زد اس وقت پڑی جب وسائل کی کمی کے خدشے کے پیش نظر آبادی کم کرنے کے نظریے کو قصداً فروغ دینے کی کوشش کی گئی۔ اسی دوران یورپ میں صنعتی انقلاب برپا ہو گیا جس کے نتیجے میں مردوں کے ساتھ ساتھ خواتین کا رجحان بھی ملازمت کی طرف ہو گیا۔ ملازمت کے ساتھ ساتھ بچوں کی پرورش ایک مشکل امر تھا، نیز ترجیحاً ملازمت بھی ان خواتین کو دی جاتی جن کے بچے نہ ہوتے۔ بچوں والی خواتین کو دوران ملازمت چونکہ مختلف مراعات بھی دینا پڑتی ہیں مثلاً میٹرنٹی لیو وغیرہ اس وجہ سے بھی خاندانی منصوبہ بندی کو فروغ حاصل ہوا، یہ چیزیں سرمایہ دارانہ ذہنیت کے منافی ہیں۔ اسی دوران مرد و زن کی مساوات اور خواتین کے حقوق کی تحریک، تحریک نسواں نے بھی سر اٹھایا جس نے عائلی زندگی کو مزید متاثر کیا۔ مرد و خواتین کے آزادانہ اختلاط کے نتیجے میں ناجائز تعلقات کو بھی فروغ ملا اور ان کے نتائج سے بچنے کے لئے خاندانی منصوبہ بندی کے طریقے عام کئے گئے اور مانع حمل ادویات کی وسیع پیمانے پر سستے داموں فراہمی ممکن بنائی گئی۔ اس طرح مادہ پرستی اور مادیت کو فروغ ملا جس کے نتیجے میں معاشرتی اقدار اور

پیمانے بدلنے لگے ۔مستحکم خاندان اور بچوں کی خواہش ماند پڑنے لگی اور شادی کا بنیادی سبب ذاتی پسند نا پسند اور محض جنسی خواہش کی تسکین رہ گیا ۔نتیجتاً خاندان کا بندھن کمزور پڑنے لگا ۔ پہلے تو خاندان چھوٹا ہوا اور پھر خواتین کی نظروں میں ہی بچوں کی اہمیت نہ رہی ۔آزاد خیالی نے اتنا زور پکڑا کہ نکاح کی ضرورت بھی محسوس نہ کی جاتی اور جوڑے بلا نکاح رہنے کو ترجیح دینے لگے ۔اب صورت حال یہ ہے کہ معمولی معمولی باتوں پر علیحدگی ہو جاتی ہے اور شرح طلاق بھی بہت بڑھ گئی ہے ۔سنگل پیرنٹ فیملی کا تصور سامنے آ گیا ہے، یعنی بچے پالنا صرف ماں کی ذمہ داری ہے ۔اس طرح خاندان کا شیرازہ بکھر کر رہ گیا ہے ۔مغرب میں بحیثیت مجموعی شرح پیدائش بہت کم ہوگئی ہے بلکہ بعض ممالک میں تو صورت حال اتنی مخدوش ہے کہ کسی قوم اور نسل کی بقا کے لئے کم سے کم مطلوبہ شرح پیدائش سے بھی گر گئی ہے ۔ نتیجتاً ملک وقوم کے معاملات چلانے کے لئے مطلوبہ افرادی قوت میں کمی کا مسئلہ درپیش ہے اور روز بہ روز غیر ملکی افراد کا آبادی میں تناسب بڑھتا چلا جا رہا ہے جس سے انہیں یہ خدشہ بھی لاحق ہو گیا ہے کہ کہیں یہ غیر ملکی افراد ہی ہم پر غالب نہ آ جائیں معاملہ اس قدر آگے بڑھ چکا ہے کہ اب خود ان ممالک میں حکومت خواتین کو بچے پیدا کرنے کے لئے بہت سی مراعات فراہم کرتی ہے اور ترغیب دیتی ہے مگر خواتین کی طرف سے مثبت ردعمل نہ ہونے کے برابر ہے ۔ اب وہ اپنے آرام میں خلل اور بچے پالنے کے جھنجھٹ میں ہی پڑنا نہیں چاہتیں فطرت سے انحراف کی سزا دینے کے لئے فطرت انتقام پر اتر آئی ہے ۔بقول سید مودودیؒ مغرب اپنے ہی ہاتھوں اپنی نسل کشی کے ذریعے خودکشی کی راہ پر گامزن ہے (تفہیمات بحوالہ مغرب کی خودکشی) ۔آج علامہ اقبال کی پیشن گوئی بھی پوری ہوتی نظر آتی ہے۔

تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی
کرے گی

جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائیدار ہوگا

مغرب کے منتشر اور بکھرے ہوئے خاندان میں سب سے زیادہ مظلوم اور متاثر بچے ہیں ۔ ماں باپ کی علیحدگی کی صورت میں بچوں کی شخصیت بکھر کر رہ جاتی ہے ۔ یقیناً سوتیلے ماں اور باپ بچوں کی وہ نگہداشت نہیں کر پاتے جو حقیقی والدین کر سکتے ہیں ۔پھر ملازمت پیشہ والدین عملاً بچوں کو وقت ہی کتنا دے پاتے ہیں ۔ ڈے کیئر سنٹروں یا سکولوں میں دن کا طویل حصہ گزارنے کے بعد جب بچے گھروں کو لوٹتے ہیں تو والدین کے پاس بچوں کو دینے کے لئے وقت محدود ہی ہوتا ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ والدین کی توجہ اور شفقت سے محروم یہ بچے ذہنی الجھنوں کا شکار ہوتے ہیں اور بکھری ہوئی اور غیر متوازن شخصیت کے ساتھ جوان ہوتے ہیں ۔ضدی پن، جھنجھلاہٹ، جذباتیت، نفسانیت اور دوسروں کے لئے ایثار اور قربانی کے جذبے سے عاری ہونے کے سبب بالآخر ذہنی اور نفسیاتی امراض کا شکار ہو جاتے ہیں (مغرب میں اور اب ہمارے جیسے ملکوں میں بھی بڑھتے ہوئے نفسیاتی امراض اس کا ثبوت ہیں ۔) ذہنی سکون کے لئے شراب اور منشیات کا سہارا لیتے ہیں ۔نتیجتاً جنسی بے

راہ روی بڑھ رہی ہے ۔ خاص طور پر نوجوانوں کی (ٹین ایج) میں یہ رجحان تیزی فروغ پا رہا ہے اور ناجائز تعلقات کے نتیجے میں اسقاط حمل کی شرح میں تشویش ناک حد تک اضافہ ہو چکا ہے۔

فرصت کا بیش تر وقت ٹیلی وژن کی نذر کرنے سے جہاں بچوں میں احساس محرومی پیدا ہوتا ہے اور نفسیاتی امراض جنم لیتے ہیں، وہاں جرائم کی طرف بھی رجحان بڑھتا ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ نوجوانوں میں تشدد کے واقعات میں اضافہ ہو رہا ہے ۔ کوئی طالب علم اٹھتا ہے اور اندھادھند فائرنگ کر کے بہت سے بچوں کو بے دریغ گولیوں کا نشانہ بنا ڈالتا ہے ۔ کوئی شخص جنونی پن کے تحت بہت سے افراد کو قتل کر ڈالتا ہے، انسانیت سے گری ہوئی حرکات کا مرتکب ہوتا ہے ۔ بچوں اور نوجوانوں کی یہ حالت زار مغرب کے کسی روشن مستقبل کی نوید نہیں ہے۔

مغرب میں بوڑھے والدین اور دیگر بزرگوں کی حالت بھی قابل رحم ہے۔ اولاد کے پاس اتنی فرصت کہاں کہ وہ بوڑھے والدین کو وقت دے پائیں اور خاندان کے بزرگ ان کے لئے بوجھ بنتے جا رہے ہیں ۔ اس لئے بھی کہ اب وہ پروڈکٹو یعنی کمانے کے قابل بھی نہیں رہتے ۔ یہی وجہ ہے کہ بچے اگر ڈے کیئر سنٹروں میں پلتے ہیں تو بوڑھے والدین یا بزرگ اولڈ ہاؤس یا ہوسٹل میں زندگی گزارنے پر مجبور ہیں ۔ والدین اپنے بچوں کو ایک نظر دیکھنے کو ترستے ہیں ۔ کرسمس کے موقع پر یا کسی اور ''ڈے'' پر بچوں کی طرف سے کارڈ یا فون کال ان کے لئے بڑی مسرت کا باعث ہوتا ہے ۔ مادی سہولتیں اگرچہ انہیں میسر ہیں، لیکن انسان کو انسان سے مل کر جو خوشی ہوتی ہے اور خونی رشتوں کی جو پیاس ہے، ان کا متبادل کبھی بھی ٹیلی وژن یا سہولیات نہیں ہو سکتی ہیں ۔ اہل مغرب بزرگوں کی شفقت ، رہنمائی اور ان کے تجربات سے استفادہ کرنے سے آج محروم ہیں ۔ یوں خاندان کی ایک اہم بنیاد وہ اپنے ہی ہاتھوں ڈھا چکے ہیں۔

مشرق میں والدین اور بڑے بوڑھوں کو آج بھی قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے اور ان کی خدمت کر کے دعائیں لینا باعث سعادت سمجھا جاتا ہے۔ مگر مادیت کے فروغ نے اس روایت کو متاثر کر کے رکھ دیا ہے ۔ مقام افسوس ہے کہ آج بڑے بوڑھوں کو بوجھ سمجھا جانے لگا ہے اور ہمارے ہاں بھی اولڈ ہوسٹل کا رواج جڑ پکڑنے لگا ہے مہنگائی کے ہاتھوں خواتین کی معاش کے میدان میں شمولیت کی وجہ سے بچوں کے لئے ڈے کیئر سنٹر بھی بنائے جا رہے ہیں ۔ بجائے اس کے کہ ہم مغرب سے عبرت پکڑتے، ہم خود کو بھی نہ بچا سکے!

کئی ملکوں میں خاندانی منصوبہ بندی نے آبادی کا تناسب بھی بگاڑ کر رکھ دیا ہے ۔ مردوں اور عورتوں کا فطری تناسب بھی متاثر ہو رہا ہے ۔ لڑکوں کو لڑکیوں پر ترجیح دینے کے نتیجے میں لڑکوں کا تناسب بڑھ رہا ہے جو کئی معاشرتی مسائل کا باعث ہے ۔ الٹرا ساؤنڈ کے ذریعے معلوم کر کے بچیوں کا اسقاط کروا دیا جاتا ہے ۔ بچوں کی پیدائش میں زیادہ وقفے کی وجہ سے بھی بوڑھوں اور نوجوانوں کا تناسب بڑھ گیا ہے ۔ بوڑھوں یا چھوٹے بچوں کی تعداد بڑھ رہی ہے اور نوجوانوں، یعنی کام کرنے والے ہاتھوں کی تعداد میں تیزی

سے کمی واقع ہورہی ہے۔مغرب میں وقتاً فوقتاً ایسے سروے شائع ہوتے رہتے ہیں جو اس مسئلے کی نشان دہی کے ساتھ ساتھ تشویش کا اظہار بھی کرتے ہیں۔آج جاپان کو بوڑھوں کا ملک قرار دیا جارہا ہے۔یہ بوڑھے معیشت پر بتدریج ایک بوجھ بنتے جاتے ہیں،اس لئے کہ ان کی دیکھ بھال، رہائش اور صحت وغیرہ پر خرچ ہی خرچ ہے، کیونکہ یہ'' کماؤ پوت ''نہیں ہوتے۔

خاندانی منصوبہ بندی کس طرح سے خاندان کو متاثر کر رہی ہے اور معاشرے میں بہت سے مسائل کا سبب بن رہی ہے اس کا ایک ماڈل چین بھی ہے جو غور وفکر کے کئی پہلو سامنے لاتا ہے۔چین میں خاندانی منصوبہ بندی کا انتہائی تصور سامنے آیا ہے اور ایک بچہ ایک خاندان، کی پالیسی پر سختی سے عمل کیا جارہا ہے۔

چین آبادی کے لحاظ سے سب سے بڑا ملک ہے۔ وسائل کی قلت،غربت اور معاشی ترقی کے متاثر ہونے کے خدشے کے پیش نظر 1979ء سے چین میں، ایک بچہ ایک خاندان، کی پالیسی حکومتی سطح پر اپنائی گئی۔اس کا مطلب ہے کہ ایک خاندان میں ایک سے زائد بچے کی اجازت نہیں۔ لہٰذا خلاف ورزی کرنے والوں کو بڑے پیمانے پر جرمانے کیے گئے اور جبراً اسقاط حمل کروائے گئے۔ بتدریج لڑکیوں کے مقابلے میں لڑکوں کا تناسب بڑھنے لگا اور اس کی بنیادی وجہ والدین کی اکلوتے بچے کے طور پر بیٹے کی خواہش ہے۔ دوسری طرف اگر کسی کے ہاں بیٹے کی پیدائش ہوئی تو بیٹی کی خواہش کے باوجود قانونی پابندی کی وجہ سے ان کے ہاں دوسرا بچہ جنم نہیں لے سکتا۔

اس پالیسی کے نتیجے میں چین بظاہر اپنی آبادی میں اضافے کی شرح کو بڑی حد تک کنٹرول کرنے میں کامیاب ہوگیا ہے۔اس وقت چین کی شرح پیدائش ایک فیصد سالانہ سے بھی کم ہے۔ بظاہر معاشی ترقی کے لئے زیادہ وسائل دستیاب ہیں اور زیادہ خواتین ملازمت کرنے لگی ہیں جو افرادی قوت میں اضافے کا باعث تو ہوا ہے مگر اس کے ساتھ ساتھ مختلف مسائل نے بھی جنم لیا ہے۔

ایک عشرے کے اندر اندر ہی آبادی میں مرد وخواتین کا تناسب بگڑنے لگا۔کام کرنے والے افراد (ورک فورس) اور بوڑھوں کی تعداد میں فرق پیدا ہوگیا ہے۔ لاکھوں بوڑھوں میں بچوں کی تعداد بہت کم ہے۔چین کی آبادی میں مردوں کا تناسب عورتوں سے زیادہ ہے۔ 2 مرد اور ایک عورت کی نسبت پائی جاتی ہے۔خدشہ ہے کہ آئندہ چل کر بہت سے چینی مرد اس قابل نہ ہوں گے کہ وہ ایک خاندان کو وجود میں لاسکیں،اس لئے کہ لڑکیوں کا تناسب مروجہ خاندانی منصوبہ بندی کی پالیسی (ایک بچہ،ایک خاندان) کی وجہ سے مزید کم ہوتا جارہا ہے۔ یہ جہاں جنسی جرائم کو فروغ دے گا وہاں خود حکومت کو بھی مختلف مسائل پر عوامی ردعمل اور احتجاج کا سامنا کرنا ہوگا جو حکومت کے لئے مشکلات پیدا کرنے کا باعث ہوگا۔ یہ اسی غیر متوازن جنسی تناسب (sex ratco) کا نتیجہ ہوگا۔

خاندان کا واحد بچہ ہونے کی بنا پر غیر متوازن رویے بھی سامنے آرہے ہیں۔ بچے کی پرورش اور خواہشات کی

تکمیل پر بے جانا زنعم اٹھانا ، بے اندازہ اخراجات کرنا ، ساتھ ساتھ چونکہ بچے کے چھوٹے بہن بھائی نہ ہوں گے اس لئے وہ دوسروں کے لئے ایثار وقربانی اور برداشت جیسے رویوں سے محروم رہے گا ۔ شاید بعض رشتوں کی پہچان سے بھی وہ نا آشنا رہے ۔ نتیجتاً خودغرضانہ ذہنیت کے ساتھ پلنے والے یہ بچے ایک خودغرض معاشرے کو جنم دینے کا باعث بنیں گے ۔

۲۰۰۸ء میں چین میں آنے والے زلزلے کے نتیجے میں بڑے پیمانے پر بچوں کی ہلاکت نے بالخصوص ان والدین کو حکومتی پالیسی کے خلاف احتجاج پر مجبور کر دیا جن کے گھر اکلوتے بچے کی ہلاکت کے بعد سُونے پڑ گئے ۔ چنانچہ حکومت نے ایک بچہ ایک خاندان ، پالیسی میں اس حد تک نرمی کی ہے کہ جن والدین کے بچے ہلاک ہو گئے ہیں وہ اس پابندی سے مستثنیٰ ہوں گے مگر چین کی عمومی پالیسی ، بھی یہی ہے ۔ (بحوالہ ہفت روزہ ٹائم ، ۹ جون ۲۰۰۸ء) ۔ تاہم وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ مسائل میں اضافے سے تشویش میں اضافہ ہو رہا ہے ۔ خدشہ ہے کہ گزشتہ تین عشروں سے جاری پالیسی کے نتیجے میں آئندہ پانچ برس میں چین میں افرادی قوت روبہ زوال ہوگی ۔ ۲۰۴۰ء میں اوسط عمر بڑھ جانے سے افرادی قوت کے لئے چین کا دوسروں پر انحصار بڑھ جائے گا ۔ لہٰذا اب ''ایک خاندان اور دو بچے'' کی پالیس پر غور کیا جا رہا ہے ۔

مقام افسوس ہے کہ انسان اپنے ماضی اور تلخ حقائق سے سبق نہیں سیکھتا اور خدائی ہدایت سے بے نیاز ہو کر اپنی عقل کے گھوڑے دوڑاتا چلا جاتا ہے اور خواہشات نفس کا اسیر ہو کر تباہی کے راستے کو چھوڑنے پر آمادہ نہیں ہوتا ۔ آج مغرب کا تلخ تجربہ انسان کے سامنے ہے ۔ چین کی صورت حال آنکھیں کھول دینے کے لئے کافی ہے ۔ خاندانی منصوبہ بندی کس طرح سے خاندن کو جو کہ انسانی بقا اور تہذیب و تمدن کے تسلسل کے لئے ناگزیر ہے متاثر کرتی ہے مگر قومی خودکشی کے اس راستے کو ترک کرنے کے لئے انسان تیار نہیں !

ضرورت اس امر کی ہے کہ مغرب کے تلخ تجربے سے سبق سیکھا جائے اور خاندان کی روایت اور قدر کو مستحکم کیا جائے ۔ اسلام نے حقوق وفرائض کا تعین کر کے خاندان اور معاشرے کے استحکام کے لئے جو ٹھوس بنیاد فراہم کی ہے اسے مضبوط کیا جائے ۔ افرادی قوت دیگر وسائل کی طرح ایک اہم ذریعہ پیداوار ہے اسے تلف کرنے کے بجائے وسائل کی بہتر تقسیم اور تنظیم کے ذریعے اس سے بھرپور فائدہ اٹھانے کی ضرورت ہے ۔ حقیقت یہ ہے کہ خدا سے بے نیاز ہو کر انسانی عقل کس طرح سے انسانیت کو تباہی کے دہانے پر لا کھڑا کرتی ہے ..... خاندانی منصوبہ بندی کے نظریے اور اس کے تلخ نتائج میں ہمارے لئے بڑا سبق ہے ۔

اپنی ملت پر قیاس اقوام مغرب سے نہ کر
خاص ہے ترکیب میں قومِ رسولِ ہاشمی

☆☆☆

کیا اسلام اور آزادی نسواں جمع ہو سکتے ہی

تیونس کے الیکشن میں اسلام پسند چھا گئے اور بہت زیادہ فائدہ خواتین کو پہنچا۔

آکسفورڈ یونیورسٹی انگلستان سے ایک رپورٹ۔

شمالیافریقہ کے ایک چھوٹے سے ملک تیونس میں جہاں ایک پھل فروس کی خودکشی کے نتیجے میں عرب دنیا میں بیداری کی لہر پھوٹ پڑی تھی، اتوار کے روز عام انتخابات منعقد ہوئے۔ اس الیکشن میں رجسٹرڈ ووٹروں میں سے 90 فیصد نے ووٹ کا حق استعمال کیا، ایک ایسی تعداد جو اندازوں سے کہیں زیادہ تھی۔ پولنگ سٹیشنوں سے خوش باش ووٹروں کی قطاریں اُمڈ رہی تھیں جن کی انگلیوں پر نیلے رنگ سے نشان لگے ہوئے تھے۔ اور یہ لوگ فخر سے اپنی نیلی انگلیوں والے ہاتھوں کی تصویریں فیس بک پر ریکارڈ کر رہے تھے۔

لیکن پھر بھی الیکشن کے دن اس کامیاب کہانی کے باوجود مشاہدہ کرنے والے بہت سے لوگ اس خدشے کا اظہار کر رہے تھے کہ اس جمہوری عمل کے نتیجے میں اٹھنے والی اسلامی رو کہیں سب کچھ بہا کر نہ لے جائے۔ اس الیکشن میں اسلامی پارٹی النہضہ جس پر ڈکٹیٹر زین العابدین بن علی کے دور حکومت میں دہشت گرد گروہ کہہ کر پابندی عائد کر دی گئی تھی نمایاں ہو کر ابھری اور اس نے چالیس فیصد ووٹ حاصل کئے، جو ایک منہ بولتی اکثریت ہے۔

تونیس کا ایک اقلیتی سکیولر گروہ جو واویلا مچانے میں تیز ہے، یہ پیشگوئی کر رہا ہے کہ ایک ایسی نیشنل اسمبلی جس میں اسلام پسندوں کا غلبہ ہو گا ماضی میں دیئے گئے بہت سے شہری حقوق منسوخ کر دے گی جن میں عورتوں کو اسقاط حمل کا حق دینا اور متعدد ازدواج پر پابندی شامل ہے۔

تیونس میں شہری آبادی سے تعلق رکھنے والے حقوق نسواں کے کچھ سکیولر علم بردار جو فرانس کی طرز کے سکیولرزم کے حامی ہیں، النہضہ کی خواتین کے بارے میں یہ سمجھتے ہیں کہ وہ نادانستہ طور پر النہضہ کے غلبہ کی وجہ سے اس تحریک کی ایجنٹ بنی ہوئی ہیں۔ اگرچہ النہضہ تیونس کے 1956 کے ''ذاتی حیثیت کے قانون'' کی کھلم کھلا حمایت کرتی ہے جس کے بارے میں دلیل دی جاتی ہے کہ یہ عرب دنیا کا خواتین کے حقوق کی حفاظت کا سب سے زیادہ ترقی یافتہ قانون ہے۔ لیکن ناقدین اس جماعت کو دہرا موقف اختیار کرنے کا الزام دیتے ہیں۔ جب وہ فرانسیسی طرز کے سکیولرزم کے حامیوں سے بات کرتے ہیں تو وہ روا داری پر مشتمل نرم رویئے کا اظہار کرتے ہیں لیکن اپنے دیہاتی حمایتوں کے سامنے وہ شدت پسند اور رجعت پسندانہ خیالات ہی بیان کرتے ہیں۔

اُدھر التجدید پارٹی جیسے سیکولر مخالفین کا یہ حال ہے کہ بجائے اس کے کہ وہ اپنے موقف کے لئے کوئی مضبوط بنیاد تیار کریں، ان کی ساری جدوجہد صرف اس کوشش پر مبنی ہے کہ لوگوں کو اس ملک میں ایرانی طرز کی اسلامی حکمرانی اور نفاذ شریعت کا ہوّا دکھا کر ڈرایا جائے۔ مزید یہ کہ بہت سے مبصرین بھی خوف دلانے کی اس مہم میں شامل ہو رہے ہیں اور امریکہ پر زور دے رہے ہیں کہ وہ النہضہ کی طرف سے ''تباہی کے اس خطرے'' کے خلاف اُٹھ کھڑا ہوا اور'' اسلامی طرز حکمرانی کو مہذب دنیا کا دشمن قرار دے۔''

لیکن اس طرح کی خطرے کی گھنٹیاں بجانا بے حد قبل از وقت ہوگا۔ پارٹی کی سیاست میں ایک فعال کردار ادا کرنے کی وجہ سے النہضہ سے تعلق رکھنے والی خواتین کو اتوار کے الیکشن سے جتنی قوت ملی ہے اور کسی گروہ کو نہیں ملی۔

مئی کے مہینے میں تیونس کی حکومت نے سیاسی پارٹیوں کے لئے فرانس کی طرز کا ایک انتہائی ترقی پسندانہ قانون پاس کیا جس کی رو سے تمام پارٹیوں پر یہ لازم کر دیا گیا کہ ان کے الیکشن کے امیدواروں میں کم سے کم نصف امیدوار خواتین ہوں۔ ایک طویل عرصہ تک ظلم و جبر کا شکار رہنے والی پارٹی النہضہ عوام میں باقی سب پارٹیوں سے زیادہ معتبر ٹھہری اور اس کی خواتین امیدواروں کی تعداد میں سب سے زیادہ تھی اس طرح انہوں نے مرد و زن کی مساوات کا عملی ثبوت بھی مہیا کر دیا۔

النہضہ 1990ء کی دہائی میں صدر بن علی کے ہر ظلم و جبر کے ردعمل کے طور پر تیونس کی بہت سی خواتین میں سیاسی شعور پیدا ہوا۔ جب ان کے شوہر، بھائی اور بیٹے معمولی'' جرائم'' کی پاداش میں جیل میں ڈال دیئے گئے تھے۔ ان'' جرائم'' میں یہ بات بھی شامل تھی کہ وہ فجر کی نماز پڑھنے مسجد جاتے تھے۔ ان حالات میں ان خواتین کو اس بات کا ادراک ہوا کہ سیاست اب ان کی ذاتی ضرورت بن گئی ہے اور یہ کہ اب انہیں تنہا اپنے خاندان کی سربراہی کرنی ہے۔ اس سال مئی میں جب پارٹی پہ سے پابندی اٹھا دی گئی تو اسے معلوم ہوا کہ عوام میں اس کے لئے ایک وسیع البنیاد ہمدردی موجود ہے اور اس کے لئے حمایت کی جڑیں عوام میں بہت گہری ہیں۔

اتوار کے الیکشن میں عظیم فتح حاصل کرنے والی النہضہ پارٹی 217 اراکین کی قانون ساز اسمبلی میں خواتین قانون سازوں کا سب سے بڑا جتھ بھیج رہی ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ النہضہ کی یہ خواتین اپنے اختیار کیسے استعمال کرتی ہیں کیا ان کی حیثیت اسلامی لیڈرشپ کے سامنے بے اختیار اور سادہ لوح ارکان کی ہوگی یا پھر وہ واقعی حقوق نسواں کی علمبردار ہوں گی .....اسفرق کے ساتھ کہ انہوں نے سر پر سکارف اوڑھ رکھے ہوں گے۔

میں نے 46 فعال خواتین کے انٹرویو لئے جو النہضہ کی طرف سے الیکشن میں امیدوار تھیں۔ ان کی روداد سے یہ معلوم ہوا کہ ان میں سے بہت سی خواتین اس وجہ سے سیاست میں داخل ہوئیں کہ صدر بن علی کے دور میں انہیں ملازمتیں حاصل کرنے میں امتیاز سلوک کا نشانہ بنایا گیا، گرفتار کیا گیا، اور کئی سال جیل میں بھی گذارنے پڑے.....

صرف اس وجہ سے کہ وہ اپنے سر پہ سکارف پہنتی تھیں یا ان کے خاندان کے لوگوں پر النہضہ کیلئے ہمدردی کا شبہ کیا جاتا تھا ۔ان میں سے کچھ خواتین کے نزدیک اس الیکشن کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہوا ہے کہ عوام کو دینی احکام پر عمل کرنے کی آزادی حاصل ہوگئی ہے۔

''میں نے فزکس میں ماسٹر کی ڈگری حاصل کر رکھی ہے لیکن مجھے کئی سال تک معلّمہ کی ملازمت سے محروم رکھا گیا۔ صرف اس کی وجہ سے.....''

یہ کہتے ہوئے 43 سالہ خاتون نسرین نے اپنے پھولدار حجاب کا ایک کونہ پکڑ کر ہلایا.....اس نقاب پر صدر بن علی کے زمانے میں پابندی عائد تھی لیکن اب اسے قانونی جواز حاصل ہے ۔ النہضہ کی 13رکنی ایگزیکٹو کونسل کی دو خاتون ممبران معینہ ابراہیم ، اور فریدہ بیدی کے بقول یہ پارٹی اپنے اندر زوردار تنقید کرنیوالی خواتین کو خوش آمدید کہتی ہے۔ معینہ نے کہا'' آپ ہمیں ہی دیکھ لیں ، ہم میں ڈاکٹر بھی ہیں ٹیچر بھی ہیں، گھر دار خواتین بھی ،اور مائیں بھی ہیں ..... ہمارے شوہر کبھی ہماری سیاست سے اتفاق کرتے ہیں اور کبھی نہیں کرتے .....لیکن ہم یہاں موجود ہیں اور فعال ہیں۔''

ان خواتین سے یہ توقع نہیں ہے کہ وہ عورتوں کے حقوق کے لئے ہونیوالی قانون سازی کی مخالفت کریں گی۔ النہضہ کی خواتین تیونسی ہونے میں سب سے پہلے اور سب سے آگے ہیں۔ وہ اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں اور ان کے اسلامی طرز زندگی کے نمونے میں تیونس کے مجموعی معاشرے کی طرح لچک بھی ہے اور یہ نسبتاً ترقی پذیر بھی ہے۔

تیونس کی عورتوں کو 1950ء کے بعد سے باقی تمام عرب ممالک کی خواتین کے مقابلے میں زیادہ قانونی تحفظ حاصل رہا ہے۔ اب تیونس کے لوگ اس کوشش میں ہی کہ فرانس سے وارثت میں ملے ہوئے شہری حقوق اور اپنے دین پر کاربند عوام کی آرزؤں میں ایک موافقت پیدا کی جائے ۔ النہضہ کے لئے چیلنج یہ ہے کہ وہ ان دونوں کے درمیان صحیح توازن قائم کرے ۔اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے النہضہ نے واضح الفاظ میں یہ اعلان کیا ہے کہ وہ ترکی کی حکمران پارٹی (جسٹس اینڈ ڈویلپمنٹ پارٹی) کی ہمسری کرے گی۔ جس نے اپنے ملک سے کرپشن ختم کردی ہے اور عورتوں کو اختیارات میں برابر کا حصہ دیا ہے۔ مزید براں اس پارٹی نے اپنے ملک میں حیران کن معاشی ترقی کا ریکارڈ قائم کیا ہے۔

ترکی کی اعتداد پسندی اور دیانت دارانہ اقدامات سے حاصل کی گئی خوشحالی کو تیونس میں دہرانا ایک مشکل کام ہو گا جہاں بے روزگاری کا تناسب بہت زیادہ ہے اور 25 فیصد لوگ ناخواندہ ہیں۔ ترکی سٹائل کی جمہوریت تیونس میں شاید اس معیار کو نہ پہنچ سکے جہاں کچھ ہی عرصہ پہلے ایک قابل اعتراض فلم (persepolis) کی نمائش پر عوام میں شدید احتجاج پھوٹ پڑا تھا ۔ جبکہ استنبول (ترکی) کی گلیوں میں اب بھی شراب خانے اور ڈانس کلب جگہ جگہ نظر آتے ہیں۔ اور پھر یہ امکان بھی موجود ہے کہ طبقہ نسواں کے حاصل کئے ہوئے مفادات ان سے چھن جائیں ۔ جب کہ

ہمیں تاریخ بتاتی ہے، امریکہ، فرانس، الجیریا، ایران وغیرہ میں انقلابی تحریکیں ہمیشہ ہی زیادہ جنسی مساوات اور سیاست میں خواتین کے کردار میں اضافہ کا موجب نہ بن سکیں ۔ عورتیں عموماً آزادی کی ایسی تحریکوں میں نڈر ہو کر جدوجہد کرتی ہیں اور جب قومی حکومت تشکیل پاتی ہے تو انہیں ایک طرف کر دیا جاتا ہے۔

بہر کیف تیونس کی خواتین کو اس بات کا پورا اطمینان ہے کہ ان کے ساتھ ایسا نہیں ہوگا۔ اب تک تیونس نے بہت عمدہ کام یہ کیا ہے کہ عورتوں کو عبوری دور کے لئے بننے والے سب اداروں میں شامل کیا ہے ۔ یہ بات خاص طور پر اس لئے بھی صحیح ہے کہ اس کے مقابلے میں مصر کی افواج کی سپریم کونسل (جو آج کل وہاں حکمران ہے) نے اس بات پر پابندی لگا دی ہے کہ کوئی عورت کسی پارٹی کی سربراہ نہ بن سکے۔

النہضہ نے اب تک اپنی نئی سیاسی قوت کو تیونس میں عورتوں کو ملکی سیاست میں حصہ لینے کی ترغیب دینے کیلئے استعمال کیا ہے تا کہ ان کا راستہ روکنے کیلئے اس کے سرگرم لیڈر اسلام میں عورتوں کے حقوق کا ایک ایسا ماڈل پیش کر رہے ہیں جو خاص طور پر اعتداد پسند لوگوں کیلئے سکیولر جماعتوں کے ماڈل کی نسبت زیادہ قابل قبول ہے۔

ماہر گفتار، فعال اور اکثر نقاب پہننے والی النہضہ کی یہ خواتین ارکان دین اور سیاست پر یکساں مہارت کے ساتھ گفتگو کر سکتی ہیں ۔ بدعقیدہ سکیولر عناصر اور ان کے مغربی پنڈتوں کی ہراس پھیلانے والی کارروائیوں کے باوجود ان خواتین کا کام اور ان کے مقاصد ترکی کی جسٹس اینڈ ڈویلپمنٹ پارٹی کے کام ہی کی بازگشت ہے ۔ تا کہ مصر کی اخوان المسلمون کی۔

(انڈیکس فرانس، ترجمہ مقبول احمد شاہد)

☆☆☆

حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا

نمایاں خواتین کا تذکرہ..... نئے سلسلے کا پہلا مضمون

خاتونِ جنت حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ کی رشک بھری زندگی کا مختصر سا جائزہ لیا جائے تو ہم دیکھتے ہیں قریش کے مشہور تاجر خویلد بن اسد کی صاحبزادی جو ناز و نعم میں پل کر بڑی ہوئیں اور انہوں نے قریش کے ہی مشہور خاندان بنو ہاشم کے ایک صادق و امین نوجوان محمدؐ کی رفیقۂ حیات بننے کا شرف حاصل کیا۔ وہ جنہوں نے سب سے پہلے محمدؐ کی تصدیق کی سب سے پہلے اسلام قبول کیا۔ جنہیں اللہ تعالیٰ اور جبرائیلؑ کا سلام پہنچا۔ جنہیں ان کی زندگی میں ہی جنت کی بشارت دے دی گئی۔ جن کے گھر وحی نازل ہوتی رہی۔ وہ جنہوں نے شعب ابی طالب میں رسولؐ اللہ کے ساتھ محصور رہ کر رفاقت، محبت، وارفتگی اور ایثار کا مثالی کردار پیش کیا۔ وہ جنہوں نے اسلام کی خاطر اپنی تمام دولت حضورؐ کے قدموں میں نچھاور کر دی۔ حضورؐ کی محبوب بیوی جنہیں اللہ کے رسولؐ کے بچوں کی والدہ بننے کی سعادت نصیب ہوئی۔ جن کی زندگی میں حضورؐ نے دوسری شادی نہیں کی وفات کے بعد اپنے ہاتھوں سے لحد میں اتارا۔ ان کی حیات کا تذکرہ تھوڑی سی تفصیل کے ساتھ کرتے ہیں۔

پیدائش:

حضرت خدیجہؓ ۵۵۵ء کو مکہ معظّمہ میں پیدا ہوئیں۔ آپ کی والدہ کا نام فاطمہ بنت زائد بن اصم تھا اور والد کا نام خویلد بن اسد بن عبدالعزیٰ تھا۔ آپ کے والد قریش کے ہر دلعزیز سردار تھے اور عرب کے کامیاب ترین تاجروں میں انکا شمار تھا۔ ضعفِ پیری کی وجہ سے وہ اپنی وسیع تجارت کے انتظام سے عاجز تھے۔ اولادِ نرینہ کوئی نہ تھی اسی لئے انہوں نے اپنا تمام کام اپنی ذہین و فطین عاقلہ بیٹی خدیجہؓ کے سپرد کر دیا۔

نکاح اور بیوگی:

حضرت خدیجہؓ نے ہوش سنبھالتے ہی گھر میں روپے پیسے کی ریل پیل دیکھی۔ سنِ شعور کو پہنچنے کے بعد انہیں ورقہ بن نوفل سے منسوب کر دیا گیا مگر کسی وجہ سے نکاح نہ ہوا۔ اس کے بعد ابو ہالہ جس کا نام ہند بن نباش تھا سے آپؓ کا نکاح ہو گیا۔ ابو ہالہ سے آپؓ کے دو لڑکے ہوئے ایک کا نام ہالہ تھا جو زمانہ جاہلیت میں ہی مر گیا۔ دوسرے کا نام ہند تھا۔ بعض روایات کے مطابق اسے شرف صحابیت عطا ہوا۔

ابو ہالہ کے انتقال کے بعد آپؓ کی دوسری شادی عتیق ابن عابد سے ہوئی عتیق کے بعد ضیفی بن امیہ سے آپؓ کی شادی ہوئی کچھ ہی دنوں کے بعد ان کا بھی انتقال ہو گیا۔ اب حضرت خدیجہؓ بیوگی کی زندگی گزار رہی تھیں۔

آپؓ اپنا کچھ وقت خانہ کعبہ میں گزارتیں اور کچھ وقت اس زمانہ کی کاہنہ عورتوں میں صرف کرتیں اور ان سے

زمانے کے انقلاب پر وقتاً فوقتاً بحث کیا کرتیں۔قریش کے بڑے بڑے سرداروں نے انہیں نکاح کے پیغام بھیجے لیکن انہوں نے سب رد کر دیئے کیونکہ پے در پے صدمات نے ان کی طبیعت دنیا سے اچاٹ کر دی تھی۔

والد کی وفات کے بعد تجارت کی تمام تر ذمہ داری حضرت خدیجہؓ کے کندھوں پر آن پڑی۔ آپؓ نے ایک کامیاب تاجر خاتون کے طور پر عرب میں اپنی شناخت پیدا کی۔ان دنوں عرب کے تاجروں کے لئے شام اور یمن کے علاقے تجارت کے حوالے سے بہترین ملک تھے۔انہوں نے اپنی تجارت کا دائرہ وسیع کیا اور شام اور اطرافِ یمن تک اپنے کاروبار کو پھیلایا۔اس تمام کام کے لئے انہوں نے ایک بڑا عملہ رکھا ہوا تھا جو متعدد عرب، یہودی اور عیسائی ملازموں اور غلاموں پر مشتمل تھا۔حسنِ تدبیر اور دیانت داری کی بدولت ان کی تجارت روز بروز ترقی کر رہی تھی۔ اب ان کی نظریں ایسے شخص کی متلاشی تھیں جو بے حد قابل، ذہین اور دیانت دار ہو۔ جو ان کا مال شام کی منڈی میں فروخت کے لئے لے جائے اور وہاں سے مال خرید کر مکے میں لا کر بیچے۔یہ وہ زمانہ تھا جب حضور کی دیانت، امانت اور حسن اخلاق کا چرچا مکہ کے گھر گھر میں پھیل چکا تھا۔ حضرت خدیجہؓ نے حضورؐ کی خدمت میں پیغام بھیجا کہ آپؐ میرا مالِ تجارت شام تک لے جایا کریں، تو دوسرے لوگوں سے دو چند معاوضہ دوں گی۔حضرت خدیجہؓ کو تجارت کی نگرانی کے لئے ایسی ہی ہمہ صفت موصوف شخصیت کی تلاش تھی اور وہ تمام خوبیاں آپؐ میں موجود تھیں۔حضورؐ وقتاً فوقتاً اپنے چچا کی زبانی حضرت خدیجہؓ کی تجارت کا حال معلوم ہوتا رہتا کیونکہ وہ بھی تجارت کے پیشے سے منسلک تھے۔آپؐ نے ان کی اس پیش کش کو قبول کر لیا۔

حضرت خدیجہؓ نے اپنا غلام مسیرہ آپؐ کی خدمت کیلئے ساتھ روانہ کر دیا۔آپؐ مال لے کر شام گئے تو وافر مقدار میں منافع ہوا۔سفر کے دوران مسیرہ نے بعض عجیب وغریب مناظر کا مشاہدہ کیا جس سے اس کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی۔مسیرہ آپؐ کے حسنِ اخلاق، طرزِ کلام، سنجیدگی، خندہ پیشانی اور گفتار کی شیرینی سے اس قدر متاثر ہوا کہ دل و جان سے آپؐ کا گرویدہ ہو گیا۔ نہ صرف مسیرہ بلکہ تمام ہمراہی آپؐ کے مداح اور جان نثار بن گئے۔

شام کے سفر سے واپسی پر رسولؐ کچھ دیر آرام کیلئے ایک درخت کے نیچے تشریف فرما ہوئے تو ایک مشہور و معروف نسطورا نامی یہودی راہب انہیں دیکھ رہا تھا۔اس نے مسیرہ کو اپنے پاس بلایا اور پوچھا وہ درخت کے سائے میں جلوہ افروز ہونے والا کون ہے؟ مسیرہ نے پوری تفصیل کے ساتھ اسے بتایا۔اس نے کہا میری بات یاد رکھنا یہ مستقبل میں نبوت کے اعلیٰ مقام پر فائز ہوگا کیونکہ اس درخت کے نیچے آج تک نبی کے علاوہ کوئی ستانے کے لئے نہیں بیٹھا۔

یہ سب سن کر مسیرہ کو تعجب کے ساتھ ساتھ بے پناہ مسرت بھی ہوئی کہ میں کتنا خوش نصیب ہوں کہ مجھے عظیم ہستی کی رفاقت کا شرف حاصل ہوا ہے۔

دوران سفر مسیرہ نے شام سے مکے تک یہ حیرت انگیز منظر بھی دیکھا کہ دو فرشتے آپؐ کے سر پر سائے کیلئے

سائبان تانے جارہے ہیں تا کہ دھوپ کی وجہ سے آپؐ کو کوئی تکلیف نہ ہو۔

مسیرہ نے مکہ واپس پہنچنے پر سفر کی ساری روائیداد حضرت خدیجہؓ کے گوش گزار کر دی ۔ یہ ساری دل پذیر داستان سن کر وہ دلی طور پر بہت متاثر ہوئیں اور اس نہج پر سوچنے لگیں کہ کیا وہ حضورؐ کی شریک زندگی بن سکتی ہیں ۔انہی دنوں انہوں نے خواب میں دیکھا کہ چمکتا ہوا سورج گھر کے آنگن میں اتر آیا ہے جس سے پورا گھر جگمگا اٹھا ہے۔انہوں نے توریت اور انجیل کے مشہور عالم ورقہ بن نوفل سے اس کی تعبیر پوچھی یہ آپؓ کے چچا زاد بھائی تھے اور نابینا ہو چکے تھے ۔ انہوں نے خواب سن کر کہا خوش ہو جاؤ ۔ یہ چمکیلا سورج جو تیرے آنگن میں اترتا دکھائی دیا یہ نورِ نبوت ہے جو تیرے نصیب میں آئے گا اور تم اس سے فیض حاصل کرو گی ۔

کچھ روز سوچ بچار کے بعد انہوں نے اپنی سہیلی نفیسہ کی معرفت حضورؐ کو نکاح کا پیغام بھیجا ۔حضورؐ کا ایما پا کر وہ حضرت خدیجہؓ کے چچا عمرو بن اسد کو بلا لائیں اس وقت وہ ان کے سرپرست تھے ۔

آنحضرتؐ سے نکاح:

اس وقت حضورؐ کی عمر مبارک پچیس (۲۵) برس تھی اور حضرت خدیجہؓ کی عمر چالیس برس ۔حضورؐ کے چچا ابو طالب کی رضا مندی سے آپؐ نے شادی کی اس پیش کش کو قبول کر لیا ۔آخر کار رسولؐ اللہ کے چچا ابو طالب اور حضرت حمزہؓ سیدہ خدیجہؓ کے گھر پر آئے ۔ دونوں طرف سے اکابرین خاندان جمع ہوئے ۔ابو طالب نے نکاح کا خطبہ پڑھا اور ۵۰۰ درہم طلائی مہر مقرر ہوا ۔حضورؐ کی رضاعی والدہ حلیمہ سعدیہ کو بطورِ خاص بلایا گیا ۔ جب وہ فارغ ہو کر جانے لگیں تو حضرت خدیجہؓ نے انہیں چالیس بکریاں ، ایک اونٹ اور بہت سا گھریلو سامان دے کر رخصت کیا ۔

شادی کے بعد اللہ تعالیٰ نے انہیں قاسمؓ ، زینبؓ ،عبد اللہؓ ،رقیہؓ ،ام کلثومؓ اور فاطمہؓ جیسی اولاد عطا کی ۔قاسم اور عبد اللہ کم سنی میں انتقال کر گئے ۔اسی دوران رسولؐ اللہ کی طبیعت دن بدن دنیا کی رعنائیوں سے اچاٹ رہنے لگی ۔ آپؐ کئی کئی روز تک مکہ کے پہاڑوں میں جا کر عبادتِ الٰہی میں مشغول رہتے ۔غرض اسی طرح دس برس گزر گئے ۔

پہلی وحی اور حضرت خدیجہؓ کی تسلی و تشفی:

ایک روز رسولؐ اللہ غارِ حرا میں معتکف تھے کہ رب ذوالجلال کے حکم سے جبرائیلؑ آپؐ کے پاس تشریف لائے اور کہا ''قم یا محمد'' حضورؐ نے نظریں اوپر اٹھائیں تو اپنے سامنے ایک نورانی صورت کو کھڑے پایا جس کے ماتھے پر کلمہ طیبہ بخطِ نور رقم تھا ۔ جبرائیل امینؑ نے حضورؐ کو گلے لگا کر دبایا اور کہا اقراء (پڑھ) ۔حضورؐ نے کہا میں پڑھا لکھا نہیں ہوں تین بار جبرائیلؑ نے یہی کہا ۔

اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ (پڑھ اپنے رب کے نام سے جس نے سب کچھ پیدا کیا) تو حضورؐ کی زبان مبارک پر یہی کلمات جاری ہو گئے ۔

اس حیرت انگیز واقعہ سے حضورؐ کی طبیعت بہت متاثر ہوئی آپؐ کا تمام جسم پسینے سے شرابور ہو گیا اور آپؐ کانپنے لگے ۔گھر تشریف لا کر حضرت خدیجہؓ سے کہا ''زملونی زملونی''

مجھے کمبل اوڑھا دو۔حضرت خدیجہؓ نے فوراً حکم کی تعمیل کی اور پوچھا کہاں تھے؟ آپؐ نے تمام واقعہ ان کی گوشِ گزار کیا تو حضرت خدیجہؓ نے فرمایا:

''آپؐ سچ بولتے ہیں۔غریبوں کے دستگیر اور مہمان نواز ہیں۔صلۂ رحمی کرتے ہیں، امانت گزار ہیں اور دکھیوں کے خبر گیر ہیں اللہ آپؐ کو تنہا نہیں چھوڑے گا۔''

پھر وہ آپؐ کو ساتھ لے کر اپنے چچازاد بھائی ورقہ بن نوفل کے پاس آئیں انہوں نے یہ واقعہ سن کر کہا۔

''یہ وہی ناموس ہے جو موسیٰؑ پر اترا تھا۔اے کاش میں اس زمانے تک زندہ رہتا جب آپؐ کی قوم آپؐ کو وطن سے نکال دے گی اگر میں اس زمانے تک زندہ رہا تو آپؐ کی بھرپور مدد کروں گا۔اس گفتگو کے کچھ ہی عرصہ بعد ورقہ کا انتقال ہو گیا۔

تاہم حضرت خدیجہؓ کو کامل یقین ہو گیا کہ حضورؐ کو نبوت کی سرفرازی مل چکی ہے۔لہٰذا وہ فوری طور پر ایمان لے آئیں۔سب سے پہلے مشرف بہ اسلام ہونے والی خاتون خدیجہؓ ہیں۔

حضرت خدیجہؓ نہ صرف خود ایمان لائیں بلکہ دین کی اشاعت میں انہوں نے اپنا تن من دھن لگا دیا۔انہیں اسلام کی وسعت پذیری سے بہت مسرت حاصل ہوتی۔وہ اپنے غیر مسلم اعزا و اقربا کے طعن و تشنیع کی پروا کیے بغیر اپنے آپ کو تبلیغ حق میں رسولؐ اللہ کا دست و بازو ثابت کر رہی تھیں۔انہوں نے اپنا تمام زر و مال اسلام پر نازل کر دیا اور اپنی تمام دولت یتیموں، بیواؤں کی خبر گیری، بیواؤں کی دستگیری اور حاجت مندوں کی حاجت روائی کیلئے وقف کر دی۔ادھر کفارِ قریش نو مسلموں پر طرح طرح کے مظالم ڈھا رہے تھے اور تبلیغ حق میں روڑے اٹکا رہے تھے۔انہوں نے رحمت عالم اور آپؐ کے جاں نثاروں کو ستانے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی تھی۔جب کبھی حضورؐ کفار کی لایعنی باتوں سے کبیدہ خاطر ہوتے تو خدیجہؓ الکبریٰ عرض کرتیں،

''یارسولؐ اللہ آپؐ رنجیدہ نہ ہوں بھلا کوئی ایسا بھی رسول آیا ہے جس سے لوگوں نے تمسخر نہ کیا ہو''

حضرت خدیجہؓ کے کہنے سے حضورؐ کا ملال طبع دور ہو جاتا۔حضورؐ فرمایا کرتے ''میں جب کفار سے کوئی بات سنتا اور وہ مجھے ناگوار معلوم ہوتی تو میں خدیجہؓ سے کہتا وہ اس طرح میری ڈھارس بندھاتی تھیں کہ میرے دل کو تسکین ہو جاتی اور کوئی رنج ایسا نہ تھا جو خدیجہؓ کی باتوں سے آسان اور ہلکا نہ ہو جاتا۔''

عضیف کندی کا بیان ہے کہ ایک دفعہ میں زمانۂ جاہلیت میں کچھ اشیاء خرید نے کیلئے مکہ آیا اور عباس ابنِ مطلب کے پاس ٹھہرا۔اگلے روز میں کعبہ کے پاس سے گزرا تو میں نے دیکھا کہ ایک نوجوان شخص آیا اس نے اپنا سر آسمان کی طرف اٹھا کر دیکھا اور پھر قبلہ کی طرف منہ کر کے کھڑا ہو گیا۔تھوڑی دیر کے بعد ایک نوخیز لڑکا آیا جو پہلے جوان کے ایک جانب کھڑا ہو گیا پھر ایک عورت آئی وہ ان دونوں کے پیچھے کھڑی ہو گئی۔تینوں نے نماز پڑھی اور چلے گئے۔میں نے عباس سے کہا۔

''عباس ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مکہ میں انقلاب آنے

والا ہے'' عباس نے کہا ہاں تم جانتے ہو یہ کون ہیں۔ میں نے کہا نہیں۔ وہ بولے یہ دونوں میرے بھتیجے محمدؐ بن عبداللہ اور علیؓ بن ابو طالب ہیں اور یہ عورت محمدؐ کی بیوی خدیجہؓ ہیں۔ میرے بھتیجے کا یہ دعویٰ ہے کہ اس کا دین الہامی ہے اور وہ اپنا ہر کام اللہ کے حکم کے مطابق کرتا ہے لیکن ابھی تک ان تینوں کے علاوہ کوئی اور انکے دین کا پیروکار نہیں ہے۔ عباس کی باتیں سن کر میرے دل میں خواہش پیدا ہوئی کہ اے کاش چوتھا میں ہوتا

شعب ابی طالب اور حضرت خدیجہؓ

حضورؐ کے نبی بننے کے ساتویں سال مشرکین قریش نے بنو ہاشم اور بنو مطلب کو شعب ابی طالب میں محصور کیا تو حضرت خدیجہؓ بھی اس ابتلا میں آپؐ کے ساتھ تھیں۔ تین برس تک اس محصوری کے روح فرسا آلام و مصائب بڑے صبر اور حوصلے سے جھیلتی رہیں۔

۱۰ نبوی میں محاصرہ ختم ہوا اس کے بعد حضرت خدیجہؓ زیادہ دیر زندہ نہ رہیں۔ رمضان المبارک سے چند دن پہلے ان کی طبیعت ناساز ہوئی۔ حضورؐ نے علاج معالجہ تسکین و تشفی میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی تھی لیکن موت کا کوئی علاج نہیں۔

وفات سے چند لمحات پہلے حضورؐ نے ان کو نزع کی حالت میں دیکھتے ہوئے فرمایا آپ جس چیز کو ناپسند کر رہی ہیں اللہ پاک نے آپ کیلئے اس میں خیر و برکت کے خزانے رکھے ہوئے ہیں۔ یہ سن کر ان کی آنکھوں میں مسرت و شادمانی کی چمک پیدا ہوگئی۔ زندگی کے آخری لمحات میں ان کی نگاہیں رسولؐ کے چہرہ اقدس پر گڑی ہوئی تھی کہ ان کی پاکیزہ روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی انا للہ و انا الیہ راجعون کلمہ معظّمہ کی بالائی جانب مقام حجون میں ان کی قبر تیار کی گئی حضورؐ بذات خود قبر میں اترے اور رفیقۂ حیات کے جسدِ اطہر کو اپنے ہاتھوں سے لحد میں اتارا۔ حضرت خدیجہ کی وفات تک نماز جنازہ نہیں پڑھی جاتی تھی۔ رمضان المبارک کے مقدس مہینے میں ۶۵ برس کی عمر میں آپؓ نے وفات پائی۔

حضرت خدیجہؓ کے مناقب وفضائل:

کاروباری معاملات میں وہ عرب کے بڑے بڑے تاجروں کو پیچھے چھوڑ گئیں اپنی فہم و فراست اور ایمانداری سے عرب کی سب سے مالدار خاتون ہونے کا شرف حاصل ہوا۔

حضرت خدیجہ بہترین ماں تھیں اولاد پر نہایت شفقت فرماتیں۔ امور خانہ داری سے کما حقہ واقف تھیں گھر کا انتظام بہت اچھا کرتیں انہی خوبیوں کی وجہ سے حضورؐ نے ان کے حق میں یہ الفاظ کہے'' کانت ام العیال وزینت البیت''

بحیثیت بیوی آپ بہترین رفیقہ حیات تھیں تمول و ثروتمند ہونے کے باوجود ہر معاملے میں حضورؐ کی عزت و تکریم کرتیں۔ جو کچھ حضورؐ فرماتے اس کی تصدیق کرتیں۔ یہ حالت آپؓ کی زمانہ بعثت سے پہلے بھی اور بعد میں بھی رہی۔

حضورؐ کی نہایت ہمدرد دلسوز بیوی جو شوہر کی رضامندی اس کی اطاعت راحت و آسانی میں کوشاں رہنے کے علاوہ

اپنی عقل مندی سے تمام صدمات دور کر دیتی ہو۔ مخالفوں اور مشرکوں کی مخالفت کو غیر اہم ثابت کر دیتی ہو وہ شوہر کو کہاں تک محبوب نہ ہوگی۔

آپؓ نہ صرف حضورؐ کی بہترین مشیر تھیں بلکہ اسلام کی بھی سچی مشیر تھیں تبھی تو اپنا تمام مال اسلام کی اشاعت میں لگا دیا۔

حضرت خدیجہؓ کا مرتبہ اللہ اور فرشتوں کی نگاہ میں

حضرت خدیجہؓ کے اوصاف حمیدہ اور اخلاق حسنہ اللہ تعالیٰ کو اس قدر پسند آئے کہ حضرت جبرائیلؑ کو آسمان سے بطور خاص سلام کہنے بھیجا۔

ایک بار حضرت خدیجہؓ آنحضرتؐ کی تلاش میں نکلیں یہ وہ زمانہ تھا جب سارا عرب آپؐ کا دشمن ہو رہا تھا۔ راستے میں جبرائیلؑ ایک مرد کی صورت میں ملے اور ان سے نبیؐ کی بابت پوچھا یہ ڈر گئیں کہ کہیں کوئی دشمن نہ ہو جو آنحضورؐ کو قتل کر دینا چاہتا ہو۔ گھر پہنچ کر آپؐ سے اس واقعہ کا ذکر کیا تو آپؐ نے انہیں بتایا کہ وہ جبرائیلؑ تھے اور آپؐ کو سلام کہہ رہے تھے ۔

ایک اور روایت ہے حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے رسولؐ نے ارشاد فرمایا میرے پاس جبرائیلؑ آئے اور مجھے بتایا کہ خدیجہؓ برتن اٹھائے آ رہی ہیں اس میں کچھ کھانے پینے کا سامان ہے۔ جب وہ آپؓ کے پاس آئیں تو انہیں اللہ رب العزت اور میرا سلام کہنا اور جنت میں ایسے گھر کی بشارت دینا جو ہیروں سے بنا ہوا ہوگا اس پر یاقوت سے مینا کاری کی گئی ہوگی۔ اس میں کوئی شور وغوغا نہیں ہوگا اور نہ ہی کوئی محنت مشقت ہوگی۔

اللہ کے نبیؐ کی حضرت خدیجہ سے محبت

حضرت خدیجہؓ نے اپنی وفا شعاری اور محبت سے آپؐ کے دل میں گھر کر لیا تھا اسی بنا پر آپؐ نے ان کی وفات کے صدمے کو شدت سے محسوس کیا۔ خولہ بنت حکیم آپؐ کے پاس تعزیت کیلئے آئیں تو آپؐ نے ان سے کہا ''خدیجہؓ میرے بچوں کی شفیق ماں تھی، میری غم گسار اور راز داں تھی، اس نے مشکل وقت میں میرا ساتھ دیا میری رفاقت میں آ کر وہ دنیا کی ہر چیز بھول گئی۔ اس نے محبت وفاداری اور سلیقہ شعاری کا حق ادا کر دیا۔ مجھے بھلا وہ کیوں نہ یاد آئے میں اسے کس طرح بھول سکتا ہوں۔''

حضرت انس بن مالکؓ فرماتے ہیں رسولؐ کے پاس جب کوئی چیز لائی جاتی تو آپؐ فرماتے یہ چیز فلاں عورت کے گھر پہنچا دو یہ خدیجہؓ کی سہیلی تھی۔

حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں رسولؐ اللہ جب کبھی بکری ذبح کرتے تو فرماتے کہ گوشت خدیجہؓ کی سہیلیوں کے گھر پہنچا دو۔ میں نے ایک روز آپؐ کے سامنے اس رویے کا ذکر کیا تو آپؐ نے فرمایا جن سے خدیجہؓ کو تعلق خاطر تھا میں بھی انہیں قدر کی نگاہ سے دیکھتا ہوں۔ میرے دل میں خدیجہؓ کی محبت گھر کر چکی ہے۔

ایک اور جگہ حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ جب بھی رسولؐ اللہ خدیجہؓ کا ذکر کرتے دیر تک ان کی تعریفوں میں رطب اللسان رہتے وہ کہتیں میں کسی عورت سے اتنی جز بز نہ ہوئی جتنی خدیجہؓ سے کیونکہ نبی کریمؐ کثرت سے ان کا تذکرہ

کرتے جونسوانی غیرت کا باعث بنتا۔

ایک دن رسولؐ نے ان کا ذکر کیا تو مجھے بہت رشک آیا اور میں نے کہا وہ بڑھیا تھیں اب اللہ نے آپ کو ان سے بہتر بیوی دے دی ہے یہ سن کر آپؐ غصہ میں آ گئے اور فرط غضب سے موئے مبارک کھڑے ہو گئے اور فرمایا ''نہیں بخدا مجھے اس سے بہتر بیوی نہیں ملی۔ وہ ایمان لائیں جب سب لوگ کافر تھے اس نے میری تصدیق کی جب سب نے مجھے جھٹلایا۔اس نے میری مال سے مدد کی جب دوسروں نے مجھے محروم رکھا اور اللہ نے مجھے اس سے اولاد دی۔''

حضرت عائشہؓ کہتی ہیں اس کے بعد میں نے جی میں کہا کہ آئندہ میں ان کا ذکر برائی سے کبھی نہ کروں گی ۔ رسولؐ کی محبت کا ایک ثبوت یہ بھی ہے کہ جب تک خدیجہؓ زندہ رہیں آپؐ نے کسی دوسری عورت سے شادی نہیں کی۔

حضرت عبداللہ بن عباس سے روایت ہے ایک روز رسولؐ نے زمین پر چار لکیریں لگائیں اور فرمایا کیا تم جانتے ہو ان لکیروں سے کیا مراد ہے۔سب ہم نشیں صحابہؓ نے عرض کیا اللہ اور اس کا رسولؐ ہی بہتر جانتے ہیں۔آپؐ نے فرمایا ان لکیروں سے کائنات کی افضل و برتر چار خواتین مراد ہیں

۔

(۱) حضرت خدیجہؓ بن خویلد (۲) فاطمہؓ بنت محمدؐ (۳) مریمؑ بنت عمران (۴) آسیہ بنت مزاحم (فرعون کی بیوی) یہ خواتین جنت کی عورتوں کی سردار ہوں گی ۔حضرت مریم کو والدہ حضرت عیسیٰؑ ہونے کا شرف حاصل ہے، حضرت آسیہ کے آنگن میں حضرت موسیٰؑ نے پرورش پائی، حضرت خدیجہؓ کو ام المومنین ہونے کا اعزاز حاصل ہے اور حضرت فاطمہؓ تو خواتینِ جنت کی سردار ہیں۔

حضرت خدیجہؓ کا گھر:

رسولؐ اللہ نے حضرت خدیجہؓ کی وفات کے بعد ہجرت تک انہی کے گھر میں قیام کیا۔ یہ گھر اللہ کی رحمتوں کے نزول کا مرکز بن گیا۔ہجرت کے بعد اس گھر میں حضرت علیؓ کے بھائی عقیل بن ابی طالب رہتے رہے۔کاتب وحی امیر معاویہؓ نے اپنے دور حکومت میں یہ گھر خرید کر وہاں مسجد بنوادی۔

اللہ تعالیٰ نے حضرت خدیجہؓ کے گھر کو ایسا شرفِ قبولیت بخشا کہ قیامت تک کے لئے اسے سجدۂ خلائق بنا دیا گیا ہے حضرت خدیجہؓ کے مناقب میں بہت سی حدیثیں مروی ہیں۔

نوٹ: اس مضمون کی تیاری کیلئے درج ذیل کتب سے استفادہ کیا گیا، صحابیت از علامہ نیاز فتح پوری، تذکار صحابیات از طالب ہاشمی، صحابیاتِ مبشرات از محمود احمد غضنفر۔

☆☆☆

حمد باری تعالیٰ

خالقِ کائنات ہے اللہ!
بندگی صرف اس کی کی جائے

وہ سزا وارِ حمد ہے اُسکی
کبریائی بیان کی جائے

ہاتھ پھیلائے جائیں اس کے حضور
خم جبیں اس کے در پہ کی جائے

نہ کیا جائے آرزو کو دراز
خواہشوں کو نہ ڈھیل دی جائے

ہے کسی کو اگر تلاشِ اماں
اس کے دامن میں ڈھونڈلی جائے

دل سے تسلیم کر کے اس کا وجود
حاضری اس کے در پہ دی جائے

اس کے آگے پسار کے دامن
اس کی رحمت سمیٹ لی جائے

شمیم فاطمہ

ایک الجھن ہے!

عجیب الجھن میں گھر گئی ہوں
بہت پریشان ہوگئی ہوں
دل ونظر میں تضاد سا ہے
خیال میں اختلاف سا ہے
حجاب کرلوں.....؟
کہ حسن کو بے نقاب کردوں!
کہ محفلوں میں ہے خوشنمائی
یہ چاند چہرے دمک رہے ہیں
یہ پیرہن کیا مہک رہے ہیں
کلائی میں چوڑیاں بجے ہیں
یہ بالیاں شوخیاں کرے ہیں
یہ زلف شانوں پہ کھیلتی ہے
حنائی ہاتھوں نے اک ادا سے
سنبھال رکھے ہیں کیسے آنچل!
''آتشہ کر رہا ہے کاجل
حسین پیکر
چھپالوں سب سے میں زیب وزینت
میں سادگی اختیار کرلوں!
سمیٹ لوں اپنے سارے گہنے
کہ حسن کو بے نقاب کردوں!

شمیم فاطمہ

عجب گھڑی تھی

عجب گھڑی تھی کہا جب اس نے
جو تم مرا حالِ زار لکھنا
عذاب لمحے جو میں نے کاٹے
وہ سب کے سب گُل چنار لکھنا
قلم کو اپنے گواہ کر کے
مجھے بہ نام بہار لکھنا

.....

عجب گھڑی ہے لحد پہ اس کی
میں پھول کلیاں لئے کھڑی ہوں
کھلی چنبیلی سی قبر چھو کے
خموش ہوں سوچ میں پڑی ہوں
اور ایسا محسوس ہورہا ہے
صلیب پردرد کی گڑی ہوں

.....

ہے ایک دن ہر کسی کو جانا
اُسی ڈگر پر جدھر گئی وہ
یہ فیصلہ وقت ہی کریگا
بکھر گئی یا سنور گئی وہ
کوئی مگر کہہ رہا ہے رو کے
بہار تھی سو گزر گئی وہ

.....

بہار گلشن میں آگئی ہے
پلٹ کے پھر موت کے سفر سے
شگوفے بھی کھل گئے دوبارہ
اسے میں لاؤں مگرکدھر سے
عذابِ جاں ساعتوں سے پوچھو
یا غم میں ڈوبی ہر اک نظر سے

.....

مری طرح وہ بھی کیا اب اس کو
حسیں نظاروں میں ڈھونڈتی ہیں
نکل کے پھولوں سے خوشبوئیں سب
تلاش میں اس کی گھومتی ہیں
میانِ شب بے قرار ہو کے
لحد کی مٹی کو چومتی ہیں

.....

لہو سا آنکھوں سے بہہ رہا ہے
مرا قلم مجھ سے کہہ رہا ہے
چمن میں جب بھی بہار آئے
گلوں کے رُخ پہ نکھار آئے
یہ سانحہ بار بار لکھنا
اُسے بہ نامِ بہار لکھنا

نجمہ یاسمین یوسف

جدید ساقی نامہ

ہر اک سیاسی راج کو دیکھا
بھٹو سے مہاراج کو دیکھا
نیز ایوبی رواج کو دیکھا
اور ضیائی راج کو دیکھا
شرفاء کے سر تاج کو دیکھا
اور بے نظیر سماج کو دیکھا
اب زرداری تاج کو دیکھا
گویا شاہی راج کو دیکھا
عاشقِ تخت و تاج کو دیکھا
راجوں کے مہاراج کو دیکھا

یوسف رضا گیلانی ان کا
بابر اور حقانی ان کا
الطافی، رحمانی ان کا
گجراتی دل جانی ان کا
دودھ ، ملائی ، پانی ان کا
سوٹ اور بوٹ جاپانی ان کا
رنگیں قصہ کہانی ان کا
غیر سے عشق لاثانی ان کا
بجلی ، گیس ، اور پانی ان کا
ہم سے وعدہ زبانی ان کا

دیکھا اسلام آباد کے اندر
تخت پہ ان کے بیسیوں بندر
''حکمت و دانش'' ان کے اندر
ہر کوئی گویا ایک سکندر
پی جاتے ہیں ایک سمندر
کھا کھا ہو گئے لال چقندر
جانے کب یہ ہوں گے اندر ؟
ایک سے ایک بڑا مچھندر
ہائے ری قوم ! اُف تیرے مقدر
ہوتا رہا ہے تجھ سے بلنڈر

فرزانہ چیمہ

اِک نئی صبح

دوسری طرف ہم دوسری انتہا پر چلے گئے ہم کہتے ہیں بس گھر چلنا چاہیے، چاہے عورت کی ضرورت، بچوں کو باپ کی شفقت ملے نہ ملے حالانکہ ایک مرد اور عورت کو ملا کر باہم مل کر ایک خاندان کی بنیاد رکھنی تھی جہاں پرسکون محبت بھرے ماحول میں بچوں کی تربیت ہو سکے ایسی اٹھان جس میں وہ آگے چل کر معاشرے کے مفید شہری بن سکیں ۔ اچھا ! ہماری خواتین اسٹار پلس کے ڈرامے دیکھ کر اتنا ہوشیار ہو گئیں کہ کہتی ہیں بس گھر چلنے چاہئیں چاہے بنیاد منافقت، سیاست، کم ظرفی ہی کیوں نہ ہو پھر آپ سوچیں معاشرے کی یہ ننھی ننھی فیکٹریاں اگر ان ہی اعلیٰ اصولوں پر مشتمل ہوں تو پروڈکٹ کیا نکلے گی ؟ نظر ہی آ رہا ہے یہ بتانے کی ضرورت کیا ہے ۔ غالباً نپولین نے کہا تھا تم مجھے اچھی مائیں دو میں تمہیں اچھی قوم دوں گا ۔ اب ذرا اپنی قوم کو دیکھ لیں ۔ اچھے وقتوں کا یہ ڈھائی سو گز کا بنگلہ تین نفوس کے لحاظ سے ظاہر ہے بہت بڑا تھا نیچے بڑے سے ڈرائنگ روم ، لاؤنج ، کچن اور پارکنگ کے علاوہ ایک ہی بیڈ روم تھا جو ظاہر ہے امی کے تصرف میں تھا اوپر 3 بیڈ روم کے علاوہ لاؤنج کو چھوٹا کر کے ایک خوبصورت ٹیرس بنا دیا تھا جہاں امی نے بڑے چاؤ سے جھولنے والا صوفہ، پلاسٹک کے ٹیبل اور کرسیاں رکھوا دیئے تھے ۔ غالباً حماد اور اس کی بیگم کے لئے ،ظاہر ہے امی اوپر آتی نہ تھیں، میں حماد کے انتظار میں اسی صوفے پر لیٹ گئی ۔

اس کے چہرے پر بڑی اداس سی مسکراہٹ تھی ،''پوچھ لیں جو پوچھنا ہے ویسے بھی میں پچھلے چند مہینوں سے عدالتیں ہی بھگت رہا ہوں ۔'' میں چند لمحے خاموش رہی ۔ کہاں تو بھائی سے بات کرنے کے لئے اتنی بے قرار تھی اور کہاں سرا ہی نہیں مل رہا تھا۔

''دیکھو! شادی بچوں کا کھیل نہیں ، بہت سنجیدہ مرحلہ ہے، اور اس میں سب سے اہم اور مرکزی کردار لڑکے کا ہوتا ہے، اگر وہ گھر والوں اور نئی آنے والی لڑکی میں انصاف نہ کر سکے اور بحیثیت مرد توازن نہ رکھے تو اس کی دنیا ہی نہیں آخرت بھی بگڑ جاتی ہے ۔ تمہیں پتا ہے قرآن میں مردوں کو اسی لئے قوام کہا گیا ہے یعنی نگران، ذمہ دار.....نکاح کی ڈور اگر اللہ نے تمہارے ہاتھ میں رکھی تو یہ کھیل یا دل لگی نہیں اس کی زبردست پکڑ بھی ہوگی ۔''

بولنا شروع کیا تو میں بولتی ہی چلی گئی ، کہاں کہنے کو الفاظ نہ مل رہے تھے، ویسے یہ بھی ہم خواتین کا المیہ ہی ہے ۔''

''اچھا تو آپ کا کیا خیال ہے؟ میں ایک ناسمجھ،ضدی ،کل کی لڑکی کے لئے اپنی ماں کو ناراض کر دیتا ، اپنی جنت چھوڑ دیتا ؟ تو بھی میرا خیال ہے سب سے زیادہ آپ ہی

مجھے لتاڑ رہی ہوتیں۔''

''دیکھو تم نے غالباً میری بات غور سے نہیں سنی۔'' میں نے تحمل سے کہا، ''بات یہ نہیں کہ تم اپنا سارا وزن کس پلڑے میں ڈالتے، بات یہ ہے کہ تمہیں توازن سے کام لینا چاہیے تھا۔ کیا تم اس بات کو پسند کرو گے کہ تمہاری اپنی جنت جہنم میں ہو جائے خدانخواستہ؟ تو پھر تم کس طرح صریح زیادتی کرنے پر بھی امی کو نہ ٹوک سکے۔ اسکا مطلب تو یہی ہوا کہ تمہیں ثواب گناہ سے کوئی مطلب نہیں، عام مردوں کی طرح تم نے بھی سوچا کون اس جھنجھٹ میں پڑے۔ آج ماں کا طوطی بول رہا ہے تو چلنے دو بیوی زیادتی سہہ لے گی، کل جب بیوی کا دور آئے گا تو ماں سہہ لے گی، بس ہماری زندگی عافیت سے گذر جائے معاشرے میں چاہے جنگل کا قانون چلتا ہو تو چلے۔''

حماد حیرت سے مجھے تک رہا تھا، ''مجھے یقین نہیں آ رہا یہ آپ مجھے کہہ رہی ہیں؟ آپ کی جگہ عائشہ کی بہن ہوتی تو الگ بات ہوتی۔''

میں نے مسکرا کر کہا، ''یہ غالباً تم دوسری بار کہہ رہے ہو، کیونکہ ہمارے ذہنوں سے خالصتاً عدل کا تصور محو ہو چکا ہے، آج ہمارے دماغ سچائی کو نہیں جانچتے، سامنے والے کی پوزیشن کو دیکھتے ہیں، اسی لئے پیسے والا، طاقت والا چاہے غلط بات کہے وہ صحیح لگتی ہے اور اُس سے بہتر بات کوئی غریب یا کمزور کہے تو غلط لگتی ہے یعنی جب تک میں تمہاری پیٹھ تھپتھپاتی رہوں کہ واہ میاں! کیا کمال کیا، بہت خوب، تم خوش ہو مگر جہاں تمہیں تمہاری غلطی بتائی تمہیں میں اپنی بہن ہی نہیں لگتی ذرا سوچو اگر تمہارے اردگرد سارے ایسے ہی خوشامدی لوگ جمع ہوں تو تمہیں تمہاری خامیاں کون بتائے گا؟ انسان کی اپنی نظر تو اتنی تیز ہوتی نہیں۔''

وہ خاموش رہا پھر کہنے لگا، ''اچھا آپ ہی بتایئے آخر اب کیا کروں؟''

''میں سوچتی ہوں عائشہ سے ملنے جاؤں''

میں چونکہ کافی عرصے سے یہ بات سوچ رہی تھی اس لئے کہہ دیا مگر حماد تو یہ سن کر ہی بھڑک گیا۔

''خبردار، نام بھی نہ لیجئے گا، اس طرح تو اسکا دماغ اور خراب ہو جائے گا۔'' اور یہ سن کر میں نے اپنا سر تھام لیا، ''اب یہ پٹی تمہیں کس نے پڑھائی ہے۔'' میں نے چڑ کر کہا، وہ کھسیا کر کہنے لگا۔

''زاہد نے'' پھر خود ہی وضاحت کی، ''آپ خود سوچیں اس کا دماغ تو ویسے ہی خراب تھا اگر آپ گئیں تو ان کو لگے گا، لو جی یہ تھک گئے، اس لئے جھک کر آئے ہیں لہٰذا وہ اور اکڑ جائیں گے۔'' ''ویسے یہ زاہد کون ہے؟'' میں نے سوال کیا۔

''آپ کو یاد نہیں میرا دوست شادی میں بھی شریک تھا، اسی نے مجھے مشورہ دیا تھا گربہ کشتن روزِ اول، پہلے دن سے بیوی کو ٹائٹ رکھو ورنہ بیویاں سر پر چڑھ کر ناچتی ہیں، میں نے بھی عائشہ کو پہلی رات ہی کہہ دیا تھا کہ دیکھو یہ شادی میں نے امی کے لئے کی ہے، تمہیں ہر حال میں انہیں خوش رکھنا ہوگا، مگر میرے معاملے میں تو ہر چیز الٹی ہی ثابت ہوئی اُس نے ہر بات میں انہیں تنگ کرنا شروع کر دیا بس جو کام امی

کہتیں یا تو وہ کرتی ہی نہیں یا الٹا کر دیتی پھر امی کا بی پی ہائی ہو جاتا اور تو اور سامنے سے منہ در منہ جواب دیتی۔ پتا نہیں کونسے لوگ ہیں جو یہ بکواس کرتے ہیں کہ پہلی رات جو ہدایت دو وہ عورت کبھی نہیں بھولتی۔''

میں نے ٹھنڈی آہ بھر کر کہا، ''بات کرنے کا بھی ایک طریقہ ہوتا ہے، وہ یہی بات تو بھولی نہیں، اُس کی نسوانیت کی اس سے بڑی توہین اور کیا ہوگی، تمہاری باتوں سے تو لگتا ہے کہ تمہیں ایک آیا، کام والی، اور رات کو پارٹ ٹائم جاب والی چاہیے تھی وہ بھی بغیر پیسوں کے لہٰذا تم نے شادی کر لی، بات یہ ہے کہ بیوی یہ سب بلکہ اس سے بڑھ کر بھی کام کرتی ہے مگر ایک چیز ساتھ ہوتی ہے وہ ہے ''محبت'' اور مجھے اس سارے سلسلے میں وہی چیز ندارد لگتی ہے۔''

''ہاہ، محبت'' اس نے طنزیہ انداز میں کہا، ''وہ اس قابل تو خود کو ثابت کرتی کہ کوئی اُس سے محبت کرے، کہانیوں نے، فلموں نے ساری نسل کا ستیاناس کر رکھا ہے بس دماغوں میں بھس بھر دیا ہے.....محبت محبت محبت۔''

''تم کتنے سیدھے ہو حماد؟ کہانیاں، حقیقی زندگی ہی کی عکاس ہوتی ہیں، محبت انسان کے لئے اتنی ہی اہم اور ضروری ہے، اگر شادی کے بعد ہو! محبت وہ اسمِ اعظم ہے جو پتھر سے پتھر دلوں کو موم کر سکتا ہے تو پھر بیوی پر اثر کیسے نہ کرے۔ مسئلہ یہ ہے کہ آدمی سمجھتا ہے جو میرے اختیار میں ہے اُس پہ ایسے قیمتی جذبے کیا لٹانا یہ تو باہر والوں کو موم کرنے کے کام آتا ہے۔ میاں بیوی کی زندگی کی گاڑی کو محبت کا ایندھن ملتا رہے تو وہ چلتی رہتی ہے اب تم بغیر ایندھن کے گاڑی چلاؤ گے تو وہ ایسے ہی چلے گی جیسے تمہاری چل رہی ہے رک رک کر، روتی دھوتی۔''

''سیدھی تو میرا خیال ہے آپ ہیں، آج کل کی لڑکیاں تو اتنی تیز طرار ہیں کہ وہ محبت کے نام پر بیوقوف بنتی نہیں بناتی ہیں، میرا ایک ڈاکٹر دوست ہے بیچارہ محبت کے نام پر تین سال سے خوار ہو رہا ہے محبوبہ ایک ہسپتال اور ایک بیوٹی پارلر کھلوا چکی ہے موصوف کے پیسوں پر، ایک ہسپتال خود چلاتی ہے، پارلر پر بہن کو بٹھا دیا۔ یہ حال ہے آجکل کی لڑکیوں کا۔''

وہ کافی تلخ ہو رہا تھا، میں نے مسکرا کر کہا، ''پھر تو تمہاری بیگم کافی شریف ہوئیں، نہ پارلر کا خرچہ نہ ہسپتال کا، شرافت سے شادی کر لی اور اب مزید ایک خوبصورت خوشی دینے والی ہے۔''

''رہنے ہی دیں خوشی کو، دراصل اس کے ہاتھ میری ایک اور کمزوری آ جائے گی، یہ عورتیں بچوں کے نام پر ہی تو شوہروں کو بلیک میل کرتی ہیں۔''

میں حیرت سے اُسے تک رہی تھی وہ بیوی کی مخالفت میں اتنا آگے چلا گیا تھا کہ اپنے پہلے بچے کی خوشی کو ہی بھول گیا۔ کیا نفرت محبت سے زیادہ طاقتور ہوتی ہے؟ بس اسی لمحے میں نے فیصلہ کیا کہ مجھے جو کہنا ہے کھل کر کہہ دوں، حماد کا دل تو بدگمانی کے اندھیروں تلے گم ہو چکا تھا شاید۔

''دیکھو سیدھی سی بات ہے، عائشہ تمہاری بیوی، ہونے والے بچے کی ماں ہے، بنیادی طور پر وہ تمہاری ذمہ داری ہے، میں عائشہ سے ملنے جاؤں گی مگر پچھلے چار ماہ کا خرچہ لیکر

اور جب تک وہ اپنے والدین کے گھر ہے، تمہیں بہر حال باقاعدگی سے خرچہ دینا پڑے گا۔''

میرا اندازہ تھا وہ یہ سب سن کر اچھل پڑے گا، جتنی نفرت اور بدگمانی اس کے اندر تھی اس لحاظ سے تو یوں محسوس ہو رہا تھا کہ وہ عائشہ کو تنگ کر کے اذیت دیکر خوشی محسوس کرتا ہے۔ مگر اُس نے کچھ نہ کہا، خاموشی سے چند لمحے مجھے تکتا رہا پھر کہا، ''اور کچھ؟''

مجھے ہنسی آ گئی، ''نہیں مہربانی، فی الحال آپ یہ کر دیں تو بھی بہت ہے، اس کے علاوہ یہی کافی تحائف وغیرہ لائی ہوں وہ لے جاؤں گی اپنے ساتھ۔''

''ویسے مجھے سمجھ نہیں آتی آپ وہاں امریکہ میں کیا کر رہی ہیں، یہاں آ جائیں پاکستان، خواتین کی این جی او وغیرہ کچھ کھول لیں، ڈالروں میں امداد ملے گی، روپیوں میں خرچ کریں گے دونوں بہن بھائی۔'' اس نے بڑے پرسکون لہجے میں کہا، مگر میں اس کے طنز کو سمجھ چکی تھی، مجھے غصہ بھی آیا اور افسوس بھی ہوا، اس لئے بڑے تاسف سے کہا، ''یہ محض وہ حق نہیں جو امریکن قانون کسی عورت کو دیتا ہے، یہ تو اللہ کا حکم ہے، کتنے افسوس کی بات ہے، تم مرد ہو کر ایک کمزور عورت کا حق کھاؤ یہ تمہیں زیب تو نہ دے گا۔''

اُس نے جھنجھلا کر کہا، ''مگر یہ سب میں کیوں کروں؟''

''کیونکہ تم قوام ہو، خدا نے اگر تم کو عورت پر نگران بنایا ہے، اختیار دیا ہے تو پھر تمہاری ذمہ داری بھی زیادہ ہے۔''

''آپ کا مطلب ہے ایک عورت زیادتی کرے، میری عزت خاک میں ملا دے مگر میں اپنا دوسرا گال بھی اس کے آگے پیش کر دوں کہ لو جی اور مارو، جب میں اُس سے مزید کوئی تعلق ہی نہیں رکھنا چاہتا تو پھر یہ سب کھپ کھپیا کیوں؟''

''کیونکہ تم آگے اللہ سے اچھی امید رکھتے ہو، کل جو خوبصورت رشتہ تم نے اللہ کو گواہ بنا کر جوڑا تھا، جب اس کو توڑو تو بھی اتنی ہی خوبصورتی سے، شائستگی سے توڑو، احسان کا رویہ اختیار کرو۔''

ظاہر ہے اب اس کے بعد حماد کے پاس کہنے کو کچھ رہا ہی نہ تھا۔ لیکن حماد کے مقابلے میں امی کو یہ باتیں سمجھانا زیادہ بلکہ بہت زیادہ مشکل نکلا۔

''ارے اُس کلموہی پر ہم ویسے ہی اتنا خرچ کر چکے مہندی، مایوں، ولیمے پر لاکھوں خرچ ہو گئے، جوڑا، بیوٹی پارلر کا خرچہ، انہیں تو الٹا ہمارے پیسے واپس کرنے چاہئیں۔'' امی بلبلا کر کہنے لگیں۔

''اتنے ہی فنکشن، اتنا بلکہ اس سے زیادہ خرچہ انکا بھی ہوا یہ تو آپ کو پہلے سوچنا چاہیے تھا، کیا ضرورت تھی اتنے اسراف کی؟ دیکھیں امی، کچھ چیزیں فرض ہوتی ہیں اگر وہ نہ کیں تو اللہ کی طرف سے پکڑ ہو گی، آپ نے اپنے دل اور معاشرے کی مرضی کا تو ہر کام کر لیا، چھوڑا تو اللہ کا حکم، حق مہر دینا، بیوی کو خرچہ دینا یہ سب اللہ کا حکم ہے۔'' میں نے حسبِ معمول انہیں سمجھانے کی کوشش کی کیونکہ میں اپنی آنکھوں سے قرآن میں پڑھ چکی تھی کہ اللہ تعالیٰ نے حق مہر کو، خاندانی معاملات میں نرمی کرنے کو کتنا پسند کیا اور بار بار اسکا حکم دیا۔

''پتا نہیں کونسا دین پڑھ لیا ہے تم نے ، ظاہر ہے دنیا میں بیٹھے ہیں تو دنیا داری تو نبھانی پڑے گی اب کیا جنگلوں میں نکل جائیں بن باس لے لیں تم کہو تو۔''

امی کو سخت غصہ آ رہا تھا۔ میں نے لاڈ سے ان کی گود میں سر رکھ دیا، ''امی میری پیاری امی، ظاہر ہے دنیا میں رہتے ہوئے دنیا داری تو نبھانی پڑتی ہے مگر الہ کی ناراضگی کی قیمت پر نہیں، میں عائشہ سے ملنے جاؤں گی، حماد کی بیوی کی حیثیت سے اسکا خرچہ، جو تحائف میں لائی ہوں وہ سب لیکر، ہوسکتا ہے بچے کا سامان ننھے منے کپڑے دیکھ کر اس کا دل بھی نرم ہوجائے۔'' میں نے پیار سے امی کو سمجھایا۔

''خاک نرم ہوگا'' وہ جل کر کہنے لگیں، ''ہمارے بچے کے کپڑے رُل جائیں گے، کوئی طریقہ سلیقہ تھوڑی ہے، ان کے گھر میں ، اور میرے بیٹے کی محنت کی کمائی ، اپنے گھر والوں پر لٹائے گی وہ ناقدری۔''

''وہ کیا کرتی ہے یہ میرا مسئلہ نہیں، بات یہ ہے کہ ہم دوسروں کے اعمال کے جواب دہ نہیں، یہ تو وہ جانیں اور انکا رب۔'' میں نے قطعیت سے کہا۔

''مگر ربیعہ! تم کسی بات کو سمجھا کرو،'' امی جز بز ہو رہی تھیں، ''اتنا اچھا باہر کا سامان اور کپڑے ہیں کل کو بچہ ہوگا، کوئی تقریب کریں گے تو چار لوگوں میں لیکر جائیں گے، اچھا بھی لگے گا ، ان کے رشتہ داروں کو بھی پتا چلے ہم کتنا اچھا دیتے ہیں۔''

آپ کی باتیں سن کر لگتا ہے آپ نے ''لوگوں'' کو اپنا الہٰ مان لیا ہے مگر آپ کے اِلہٰ کتنے کمزور ہیں انہیں بلا کر دکھاؤ ، بتاؤ کہ دیکھو جی یہ ہم نے دیا فلاں کو تو ہی دیکھ سکتے ہیں ، ایک میرا اللہ ہے ، نہ بلانے کی ٹینشن نہ دکھاوے کی ، چھپ کر دو ، سات پردوں کے پیچھے سے دو تو بھی جان لیتا ہے اور انشاء اللہ قبول بھی کرے گا تو پھر میرے اللہ کو خوش نہ کیا جائے؟''

میں نے آخری جملہ شرارتی سے انداز میں کہا، امی زچ ہو کر اٹھ کر چلی گئیں اب کہنے کے لئے بچا بھی کیا تھا۔ اب ایک اور معرکہ درپیش تھا، عائشہ سے ملنے کا ، امی تو صاف منع کر چکی تھیں، حماد کی انا آڑے آتی تھی۔

''میں کیوں جاؤں، اپنی مرضی سے گئی تھی ، آتی ہو تو اپنی مرضی سے آئے۔''

مجھے سخت حیرت ہوئی ، کیا انا اتنی مضبوط ہوتی ہے کہ اولاد کی محبت کو بھی بھلا دے ، بہر حال میرے لئے وہ آنے والا بچہ اور اپنے بھائی کا گھر ان معمولی جذبوں کے بالمقابل بہت اہم تھے۔ میں نے کرن سے رابطہ کیا اور اُسے قائل کر لیا کہ وہ میرے ساتھ عائشہ کے گھر چلے۔

کریم آباد کی پتلی پتلی گلیوں میں جہاں بلڈنگیں اس قدر قریب قریب بنی ہوئی تھی کہ ایک گیلری میں کھڑا ہوا آدمی سامنے والی گیلری میں کھڑے آدمی سے با آسانی ہاتھ ملا لے ، گزرتے ہوئے میں نے سوچا کبوتروں کی کابک کی طرح تنگ گھر جہاں دھوپ بھی آتے ہوئے شرماتی تھی ، کتنی گھٹن ہے یہاں پر، بھلا کیا سوچ کر عائشہ نے اتنا بڑا فیصلہ کیا ہوگا، دونوں گھروں کے معیار میں اچھا خاصا فرق تھا ، امی کا گھر سوسائٹی کے کشادہ اور نسبتاً صاف ستھرے علاقے میں تھا آج

کل کی لڑکیاں گھر بنانے کے لئے کوئی قربانی نہیں دینا چاہتیں، ظاہر ہے میں نے یہی سوچا۔

بلڈنگ میں گھستے ہی ایک لمحے کو میں ٹھٹک گئی ایسا گھپ اندھیرا تھا کہ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دیتا تھا۔ میں نے کرن سے کہا، ''مجھے تو کچھ نظر ہی نہیں آ رہا۔'' اس نے اطمینان سے قدم بڑھاتے ہوئے کہا، ''تھوڑی دیر میں آنکھیں اندھیروں کی عادی ہو جائیں گی۔'' ہم بھی تو اسی طرح اندھیروں کے عادی ہو جاتے ہیں روشنی آئے بھی تو منہ پھیر کر کھڑے ہو جاتے ہیں کہ اُف یہ تو آنکھوں کو چبھ رہی ہے۔

عائشہ کے گھر پر دستک دی تو اس کے نوعمر بھائی نے دروازہ کھولا جو اول تو ہمیں پہچان کر اندر دوڑ گیا بڑی مشکل سے واپس آیا تو چھوٹے سے بیٹھک نما ڈرائنگ روم میں بٹھا کر چلا گیا۔ بیٹھے بیٹھے تقریباً دس منٹ ہو گئے تو مجھے غصہ آنے لگا کیسے بدتمیز لوگ ہیں کم از کم گھر آئے مہمان کو اتنا انتظار تو نہ کروائیں۔ پھر عائشہ کے والد اندر آئے، آتے ہی معذرت کی کہ آنٹی ذرا پڑوس میں گئی ہیں بچے کو بھیجا ہے بس آتی ہوں گی۔ میں نے اپنے آپ کو سرزنش کی، کتنی جلدی بدگمان ہو گئی میں، ظاہر ہے بغیر اطلاع کئے اگر آپ کسی کے گھر جائیں تو ایسا ہو ہی جاتا ہے مگر آدمی کو جتنی جلدی دوسرے کی برائی نظر آ جاتی ہے اتنی جلدی اپنی نظر نہیں آتی بلکہ اپنی برائی نظر ہی کہاں آتی ہے!

انکل کی معذرت کے جواب میں میں نے بڑے اطمینان سے کہا، ''کوئی بات نہیں آنٹی نہیں تو کیا ہوا، ہم عائشہ سے مل لیتے ہیں۔''

''بس وہ بھی آ ہی رہی ہے۔'' انہوں نے پسینہ پونچھتے ہوئے کہا، ''ایک تو حبس زدہ سا کمرہ تھا اس پر لائٹ ندارد، میں نے اس پسینے کو اسی کا شاخسانہ سمجھا مگر مزید اگلے پندرہ منٹ کے انتظار کے بعد بھی کوئی نہ آیا تو مجھے کوفت ہونے لگی، غالباً امی صحیح ہی کہتی تھیں یہ لوگ جو نظر آتے ہیں وہ ہیں نہیں۔ اتنے میں عائشہ کے بھائی نے آ کر کہا۔

''ابا! باجی نے دروازہ لاک کر لیا ہے، وہ کہتی ہیں وہ کسی سے ملنا نہیں چاہتیں۔'' یہ جملہ اس نے اتنا اچانک کہا کہ ایک لمحہ کو مجھے یوں لگا گویا میرا دماغ بھک سے اڑ گیا ہو، اپنے ساتھ لائے ہوئے سارے قیمتی کھلونے، تحفے میرا مذاق اڑانے لگے، میرا دل چاہا کہ کھڑے ہو کر اس آدمی سے کہوں کہ ذرا اپنی اور اپنی اُس دو ٹکے کی لڑکی کی اوقات تو دیکھو، تم اس قابل ہی کہاں تھے کہ کسی اچھے گھر میں پڑھے لکھے لڑکے سے رشتہ ہو۔ میں نے چہرے اور گردن پر امنڈ آنے والا بے تحاشا پسینہ صاف کرتے ہوئے سوچا، حبس زدہ ماحول میں رہنے والے گھٹن زدہ لوگ مگر اسی لمحے مجھے خیال آیا اور میں نے خود سے کہا، ''ربیعہ بی بی پسینہ تو اس باپ کو بھی اتنا ہی آ رہا ہے، اگر تمہیں ذلت کا احساس ہو رہا ہے تو اس کی مجبوری بھی سمجھو جس کی مزید آگے تین بیٹیاں اور دو بیٹے ہیں ایک کثیر العیال کنبے کا باپ بلا وجہ تو بیٹی کا گھر نہ اجاڑے گا۔''

لیکن اس سے زیادہ میں کر بھی کیا سکتی تھی میں نے مایوس ہو کر اٹھتے ہوئے کہا، ''اچھا تو پھر انکل یہ کچھ تحفے وغیرہ ہیں اور یہ عائشہ کے لئے کچھ خرچ کے پیسے حماد نے

بھیجے ہیں پلیز یہ آپ رکھ لیں۔''

ابھی لفافہ میرے ہاتھ ہی میں تھا کہ عائشہ کی امی داخل ہوئیں بڑے غصے سے مجھے گھورتے ہوئے کہا۔''آپ کو کیا لگتا ہے ہم اپنی بچی کو کھلا پلا نہیں سکتے جو یہ بھیک دینے آئی ہیں۔''انہوں نے غالباً اندر آتے ہوئے کچھ الفاظ سن لئے تھے، اب تو کرن کو بھی غصہ آ گیا،''بس جی غلطی ہوگئی ہم سے ہمیں نہیں پتا تھا کہ آپ نے لڑکی کو گھر بٹھائے رکھنے کا فیصلہ کرلیا ہے۔اسی کو کہتے ہیں چھوٹے میاں تو چھوٹے میاں، بڑے میاں سبحان اللہ ظاہر ہے لڑکی کو تمیز کہاں سے آئے گی جب ماں میں نہیں۔''

یہ سننا تھا کہ ان کو پتنگے لگ گئے،''ارے اللہ برباد کرے ان کو جو دوسروں کی بیٹیوں کو برباد کرتے ہیں، ہاتھ توڑے ان کے جو معصوم بچیوں پر ہاتھ اٹھاتے ہیں، ارے میری اولاد کا خیال نہ کیا کم ازکم اپنی اولاد ہی کا کر لیتے.....''

میں ہونقوں کی طرح ان کو دیکھ رہی تھی ظاہر ہے میں اس ارادے سے وہاں نہ گئی تھی، کرن نے بھی جذباتیت کی حد کردی، چھوٹے سے لاؤنج میں جا کر سامنے ہی لاک دروازے پر گھونسے، لاتیں مارنی شروع کردیں،''نکلو باہر، بزدلوں کی طرح کیا منہ چھپا کر بیٹھی ہو، ارے ہمت ہے تو سامنے آؤ۔''

عائشہ کی بہن بھائی کینہ توز نظروں سے ہمیں گھور رہے تھے، میں نے خود کو اتنا بے بس محسوس نہ کیا تھا بالآخر میں نے چیخ کہا،''ایک منٹ پلیز آپ میری بات تو سن لیں۔''

مگر عائشہ کی امی کی آواز اور کرن کی چیخ و پکار کے بعد مزید کسی آواز کی شنوائی نہ تھی۔اب میرے پاس اس کے علاوہ اور کوئی چارہ نہ تھا لہٰذا میں نے اپنے ہی لائے ہوئے تحفوں میں سے سب سے قیمتی شو پیس اٹھایا اور دھمکی دیتے ہوئے کہا،''اگر ایک سیکنڈ کے اندر آپ خموش نہ ہوئیں تو میں یہ پھینک دونگی۔''میں نے اپنا ہاتھ بلند کرلیا اور حقیقت میں اپنی دھمکی پر عمل کر گزرتی غالباً میرے چہرے کے تاثرات سے ان کو بھی یقین آ گیا کہ آنٹی یکدم خموش ہوگئیں پھر میں جا کر کرن کر پکڑ کر لائی، زبردستی، اور صوفہ پر بٹھا کر کہا۔

''اس طرح تم میری مشکلات میں اضافہ کررہی ہو اور کچھ نہیں۔''

اس سے پہلے کہ وہ کوئی وضاحت دیتی میں نے سختی سے کہا،''پلیز چپ'' ظاہر ہے اس کے بعد مزید کوئی گنجائش نہ رہی تھی۔

یہ پاکستان کا کلچر بھی عجیب ہے یہاں ہر شخص شور مچانا ہی پسند کرتا ہے اصل میں عادت پڑ گئی ہے لوگوں کو شور مچانا اور کرنا کچھ نہیں ویسے اس میں کوئی شک نہیں کہ اس سے بڑا سکون ملتا ہے کم ازکم آدمی کا ضمیر تو مطمئن رہتا ہے کہ ہم نے خوب شور مچایا ہلا کر رکھ دیا، طوفان لے آئے چاہے گردہی کا کیوں نہ ہو، ایسا ہم کیوں کرتے ہیں؟ کیونکہ ہم کسی لمبی قربانی کے لئے تیار ہی نہیں ہیں نہ کوئی پلاننگ کرنا چاہتے ہیں نہ یہودیوں کی طرح اگلے تین سو سال کی سوچ سکتے ہیں، ہاؤ ہو کی قوم ہے، لمحوں میں جیتے ہیں ظاہر ہے پھر ایسی قوموں کا وہی حشر ہوتا ہے جو ہمارا ہو رہا ہے نہ اپنے ملک میں عزت ہے نہ باہر کہیں۔بہرحال میں نے حتمی انداز میں آنٹی اور انکل کی

طرف دیکھ کر کہا۔

''میں یہاں جھگڑا کرنے یا معاملات کو مزید بگاڑنے نہیں آئی۔''

آنٹی نے منہ بنا کر کہا، ''اب مزید بگاڑنے کو بچا کیا ہے؟''

میں نے انکل کی طرف دیکھ کر ملتجی انداز سے کہا، ''آپ پلیز آنٹی کو سمجھائیں'' انکل نے آنٹی کی طرف دیکھا اور کہا۔

''تم بات کو سن لو میرا خیال ہے سننے میں کوئی حرج نہیں۔''

''بہت شکریہ'' میں نے مسکرا کر کہا، ''دیکھئے عائشہ میری بھابھی ہے، اگر میں اس کے لئے چند تحائف لائی ہوں تو ظاہر ہے یہ کوئی احسان نہیں ہمارے رشتے کا تقاضا ہے اور اگر اس کا شوہر اس کا خرچ بھیجتا ہے تو بھی کوئی بڑائی نہیں بلکہ نہ بھیجے تو آپ کو اس کی گردن پکڑنی چاہیے کہ حضرت شادی کی ہے تو بیوی کا خرچہ دو۔ یہ شرع ہے اور شرع میں شرم کیسی؟

''ارے'' کیسی شرع، کہاں کا دین، میری بچی کے ساتھ تو پہلے دن سے ظلم ہی ہوا۔'' اب آنٹی نرم پڑیں تو اتنی کہ رونا شروع کر دیا، ''کونسے ماں باپ یہ چاہتے ہیں کہ ان کی بیٹی کا گھر اجڑے ظاہر ہے مشکل سے قرض لیکر ہم نے اس کو دھوم دھام سے رخصت کیا تھا ابھی تک تو اس کی قسطیں بھی پوری نہیں ہوئیں'' اکثر خواتین کی طرح آنٹی کو بھی ظاہر ہے یہ پتا نہیں تھا کہ کونسی بات کہاں کہنی چاہیے اور کہاں نہیں اب انکل جز بز ہو رہے تھے۔

''میری بیٹی کے ارمانوں کا خون کر دیا بھلا بتاؤ وہ پچاس برس کی خرانٹ عورت اکیلے سونے سے ڈرتی ہے میری سترہ سال کی بچی اکیلی رات کو سوتی، ارے ابھی شادی کو عرصہ ہی کتنا ہوا تھا۔'' (ان حالات میں بھی آنٹی دو سال کی ڈنڈی مارنے سے باز نہ آئیں)

میں نے اپنا سر پکڑ لیا اُف یہ نئے نئے انکشافات! میں نے معذرت خواہانہ انداز میں کہا، ''دیکھئے اب تک جو میں سن کر آئی تھی اُس سے تو یہی محسوس ہو رہا تھا کہ عائشہ کی بے صبری، تھوڑی ضد اور بڑوں کی بات نہ سننے کے سبب زیادہ تر مسائل پیدا ہوئے اس لئے میں نے سوچا اگر میں آپ لوگوں کو اور عائشہ کو سمجھاؤں تو شاید بات بن جائے مگر ظاہر ہے یہ سب مجھے نہیں معلوم تھا گو اس کے باوجود میں نے اپنی امی کو کافی سمجھایا ہے، مسئلہ یہ ہے کہ ہر شخص اپنی عینک سے حالات کو دیکھتا ہے، دنیا میں کونسا شخص ہے جس کو اپنا آپ مظلوم نظر نہیں آتا اگر آپ امی کی زبانی یہی حالات سن لیتے تو میں جس نتیجے پر پہنچی ہوں وہیں پہنچتے۔''

انکل نسبتاً سمجھدار تھے انہوں نے نرمی سے کہا، ''دیکھئے بیٹا، ظاہر ہے آپ بہت ذہین اور ان حالات کو بخوبی سمجھ رہی ہیں اسی لیے یہاں تک آ بھی گئیں، آپ بیشک عائشہ سے مل لیں، اپنی آنٹی کی بھی بات سن لیں مگر مجھے نہیں لگتا کہ اس معاملے میں مزید دم ہے میں نے شادی کے وقت ہی آپ کی والدہ سے کہا تھا کہ میری بچی کم عمر ہے، ناسمجھ ہے اب اس کو آپ سنبھال لیں، بہو نہیں اپنی بچی سمجھ کر اور انہوں نے بھی

بڑے دعوے کئے تھے مگر میں اسی نتیجے پر پہنچا ہوں کہ میں نے خدانخواستہ نہ اپنی بچی کی کوئی قیمت وصول کی ہے اور نہ وہ مجھ پر بہت بھاری ہے کہ میں دوبارہ اُسے بھیجوں۔''

میں نے ٹھنڈی آہ بھری، ''دیکھئے نا انکل، میری جس سمجھداری کی آپ تعریف کر رہے ہیں، کیا اس کا مظاہرہ آپ کی طرف سے بھی نہ ہونا چاہیے؟'' جب میں نے یک طرفہ بات سن کر کوئی نتیجہ نہیں نکالا تو آپ کیونکر یہ کر سکتے ہیں۔ ہمارا مذہب ہمیں عدل کا حکم دیتا ہے اور یک طرفہ بات سن کر عدل کے ساتھ فیصلہ نہیں کیا جاسکتا۔ عدل ہونا چاہیے چاہے ضرب پڑے میری والدہ پر یا آپ کی بیٹی پر، ویسے بھی قرآن کہتا ہے اگر میاں بیوی کی نہ بنے تو دو عادل افراد مرد کی طرف سے اور اسی طرح عورت کی طرف سے مل کر اصلاح کی کوشش کریں انشاءاللہ اگر ان کی نیت اچھی ہو گی تو اللہ اُسی کوشش میں برکت ڈال دیں گے۔ بات یہ ہے کہ ہم تعصب برتے بغیر ایک دوسرے کی بات سن تو لیں۔''

نہ معلوم کونسی بات ان کی سمجھ میں آئی اور انہوں نے آنٹی سے کہا، ''بہر حال یہ عائشہ کی نند ہے اُس سے ملنے آئی ہے اور ہماری مہمان ہے'' اور بالآخر مجھے بھابھی محترمہ سے ملنے کا اعزاز حاصل ہوا۔

عائشہ کا کمرہ بھی ویسا ہی روشنی ہوا سے محروم گھُٹا گھُٹا سا تھا، اس کے چہرے پر زردی سی تھی میرا خیال ہے ابھی ساتواں مہینہ شروع ہوا تھا۔ میں نے اس کا ہاتھ تھام کر گرمجوشی سے سلام کیا مگر اُس کے انداز میں عجیب سرد مہری تھی ظاہر ہے وہ ان حالات کا قدرتی نتیجہ تھی ابھی ہم بیٹھے ہی تھے کہ چائے آ گئی بے اختیار میرے چہرے پر مسکراہٹ آ گئی۔ کرن نے حیرانگی سے مجھے دیکھا، میں نے کہا، ''انسان کی زبان میں بڑی طاقت ہے ابھی تھوڑی دیر پہلے ہم بڑے بے عزت ہونے والے تھے اب اتنی عزت ملی کہ چائے آ گئی'' میرے اس ہلکے پھلکے جملے پر بھی وہ بے تاثر چہرہ لیے بیٹھی رہی مگر کرن نے تلخی سے کہا۔

''ایسی چائے تمہیں ہی مبارک ہو، اتنی بے عزتی کے بعد کس کا دل ہوگا کہ اسے منہ لگائے، لڑکی والے ہو کر اتنا نخرہ، ہنہ۔''

اُس نے ناک پر سکوڑی اور ماتھے پر بل دیکر کہا، بس یہ کہنا قیامت ہو گیا، عائشہ نے غصے سے کہا، ''لڑکی والے ہونا اتنا ہی بڑا عیب ہے تو یہ کیوں نہیں سوچتیں کہ آپ بھی کسی کی لڑکی ہیں، کیا آپ کے ماں باپ لڑکی والے نہیں؟''

کرن کہاں ہار ماننے والی تھی فوراً بولی، ''توبہ توبہ کتنی بڑی زبان ہے اس لڑکی کی خالہ صحیح کہتی ہیں، جب یہاں اتنا بول رہی ہے تو وہاں کتنا بولتی ہوگی۔''

یہ حالات دیکھ کر مجھے یہی مناسب لگا کہ آج کی ملاقات یہیں روک دی جائے جو بات میں عائشہ سے کرنا چاہتی تھی وہ پرسکون ماحول میں ہی ہوسکتی تھی اور فی الحال اس کی نوبت نہ آ رہی تھی، ہم نے عائشہ کی خیر خیریت دریافت کی اور دوبارہ آنے کا عندیہ دیکر گھر روانہ ہو گئے۔ کرن بہر حال سخت ناخوش تھی اس کا خیال تھا کہ امی کی ان لوگوں کے بارے میں رائے بالکل صحیح ہے مگر مجھے یہ لگا کہ جھگڑے میں لڈو نہیں بٹتے ظاہر ہے جن حالات میں ہم ان کے گھر گئے

تھے اسی قسم کے رویے متوقع تھے۔

مجھے پاکستان آئے ایک مہینہ ہو چکا تھا۔ جو کچھ میں نے دیکھا اور سمجھا اس سے مجھے تو یہی محسوس ہوا کہ معاملات محض ضد اور انا میں خراب ہوئے ہیں بظاہر یہ اختیارات کی جنگ تھی جو ساری دنیا میں جاری ہے، اگلے ہی ہفتے میں نے امی کو بتائے بغیر پھر عائشہ کے گھر جانے کا پروگرام بنایا حماد کے علم میں تھا اسی لئے اُس نے مجھے کہا کہ پہلے جا کر کونسا عزت ملی جو آپ پھر چل دیں مگر مجھے بہتری کی امید تھی اس لئے میں نے ہمت نہ ہاری اس مرتبہ آنٹی کا رویہ بھی کافی بہتر تھا۔ میں عائشہ کے پاس جا کر اطمینان سے بیٹھ گئی، میں آج اُس سے تفصیلی گفتگو کرنا چاہتی تھی مگر وہ کھل کر کچھ کہتی ہی نہ تھی خموشی سے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھی تھی۔ خیر خیریت دریافت کرنے کچھ عمومی گفتگو کے بعد میں اسی موضوع پر آ گئی۔

''آخر پھر تم نے سوچا کیا ہے؟ اب یہ محض دو زندگیوں کا معاملہ نہیں۔''

''یہ مجھ سے زیادہ کون محسوس کر سکتا ہے'' وہ تلخ ہو کر بولی۔

''ماں بننے سے عورت میں زیادہ ٹھہراؤ اور برداشت آ جاتی ہے، کیا تم ان چھوٹی چھوٹی باتوں کے لئے اپنے بچے سے اُسکا باپ چھین لوگی؟'' میں نے تحمل سے کہا۔

''ساری ذمہ داری ماں ہی کی ہے؟ باپ کی کوئی ذمہ داری نہیں، وہ کیوں یہ نہیں سوچتے۔''

اُس کے پاس گویا ہر سوال کا جواب موجود تھا۔ میں نے ہار مان کر کہا، ''چلو وہ نہیں سوچتا تو تم سوچ لو، ایک خوبصورت تعلق کو محض انا اور ضد کی بھینٹ نہیں چڑھایا جا سکتا۔''

''یہ بھی آپ کی غلط فہمی ہے'' اُس نے میرے خیالات کو یکسر مسترد کر دیا۔

''نہ یہ ضد ہے نہ انا پرستی، پچھلے آٹھ دس ماہ میں، میں ہر حربہ آزما کر دیکھ چکی ہوں، حماد کو رات بھر کے لئے اور آپ کی والدہ کو دن بھر کے لئے ایک کام والی کی ضرورت تھی، جب تک میں چپ چاپ یہ ضرورت پوری کرتی رہی، دونوں اپنی دنیا میں مگن تھے مگر جونہی میری طبیعت خراب ہوئی اور میں نے بھی اپنے حق کے لئے آواز اٹھائی تو مجھے گھر سے نکال دیا۔''

''اپنے حق کے لئے آواز اٹھانے میں کچھ جلدی نہیں کر دی تم نے؟''

''آٹھ دس ماہ بس؟'' میں نے اس سے پوچھا۔

''تو آپ کیا چاہتی ہیں؟ میں کوئی انیس سو ساٹھ کی ہیروئن تھوڑی ہوں جو اپنا حق حاصل کرنے کے لئے پوری زندگی انتظار کرے۔'' عائشہ نے تلخی سے کہا۔

''چلو تو پھر آگے کیا ارادہ ہے یہ بھی بتا دو؟'' میں نے ٹھنڈی آہ بھر کر کہا۔

''میں اپنا کیریئر بناؤں گی، میں کسی کی غلام بن کر زندگی نہیں گزار سکتی۔''

''بہت خوب'' میں نے اُسے کھل کر بولتے دیکھ کر کہا، ''تو کیریئر کیسے بناؤ گی!'' کیا کوالیفکیشن ہے تمہاری؟''

''اس شادی کے چکر میں کیا خاک پڑھ پائی ابھی بی اے ہی کیا تھا کہ ماں باپ نے شادی کر دی'' وہ گویا ہوئی۔

''تو ظاہر ہے، اب تم ماسٹرز کرو گی پھر کسی آفس میں نوکری کرو گی اور جاتے ہی تمہیں ایم ڈی کی پوسٹ تو ملے گی نہیں پہلے کوئی کلرک طرح کا کام ہوگا ساتھ دو چار لوگ کام کرتے ہوں گے دو چار تمہارے اوپر باس لیول کے لوگ ہوں گے اُن سب سے بنا کر رکھنا، طور طریقے سے چلو گی تو کوئی دس پندرہ سال میں کسی مقام تک پہنچو گی تو اگر یہی جدوجہد گھر بنانے کے سلسلے میں کرنی پڑے تو اس سے کیوں گھبرا رہی ہو؟''

''آپ نہیں سمجھیں گی'' اس نے بے بسی سے ہاتھ ملتے ہوئے کہا، ''جب انسان کی انا پر ضرب لگتی ہے، جب ایک جیتے جاگتے فرد کو ذلیل کیا جاتا ہے تو کتنی تکلیف ہوتی ہے، محض دو روٹی کا مسئلہ ہے تو اللہ نے ایسے ہی دو ہاتھ مجھے بھی دیکر پیدا کیا ہے میں کیوں اپنی عزتِ نفس کو داؤ پر لگاؤں؟''

اس دوران آنٹی بھی آ کر بیٹھ گئی تھیں، وہ جذباتی ہو کر کہنے لگیں، ''ہمیں ہماری بچی کی دو روٹی بھاری تو نہیں، شادی کی ہے بچی تھوڑی ہے جو کسی سے ڈریں۔''

''سلطان راہی کی طرح بڑھک مارنے کی بیماری ہے ہماری قوم کو'' میں نے مزید ٹھنڈی آہ بھر کر سوچا، پھر رسان سے کہا،

''جہاں انسان ہوں وہاں تقریباً ایسے ہی مسئلے آتے ہیں، آفس میں باس ماتحت کو انسان نہیں محض نوکر سمجھتا ہے، بیس گریڈ والا اٹھارہ گریڈ والے کو رگیدنے میں کوئی عار محسوس نہیں کرتا بلکہ اس بنیاد پر تعلقات اور دوستیاں بنائی اور توڑی جاتی ہیں، اچھے خاصے دوست تھے، کلاس فیلو تھے اب ایک کا گریڈ اوپر دوسرے کا نیچے ہے تو ملنے ملانے میں جان جاتی ہے حتیٰ کہ یہ امیر رشتہ دار غریب رشتہ دار سے کٹتا ہے کہ کمبخت کچھ مانگ نہ لے تو پھر اگر اس رشتہ میں جو دنیا کا متنازعہ ترین رشتہ ہے ساس بہو کے ساتھ وہ سلوک کرتی ہے جو نوکر کے ساتھ بھی نہیں کرتی تو اس میں اس کا کیا قصور ہے پتا ہے کہ نوکر بھاگ جائے گا بہو نہیں بھاگ سکتی۔'' میں نے ہلکے پھلکے انداز میں کہا، ''تمہیں نہیں پتا تھا یہ رشتہ ہی ایسا ہے؟''

''ہمیں تو امی نے کہا تھا ساس کو ماں سمجھنا'' اُس نے اپنی اماں پر ملبہ گرایا۔

آنٹی ذرا جز بز ہوئیں، ''ہاں تو کیا غلط کہا تھا، قدر دان لوگ ہی نہ ملے'' انہوں نے تاسف سے کہا۔

''تمہیں پتا ہے ہم لڑکیوں کو کیوں پڑھاتے ہیں'' میں نے ذرا غیر متعلق سا سوال کیا اور پھر خود ہی جواب دیا۔

''تاکہ وہ دنیا دیکھ لیں، ہمیں اُن سے یہ ٹکے ٹکے کی نوکریاں نہیں کرانی ہوتیں، الگ الگ اداروں میں، الگ الگ لوگوں سے واقفیت ہوتی ہے ہر قسم کے انسانوں سے واسطہ تعلق رکھنا آ جائے، تم نے کتابیں رٹنے کے علاوہ کچھ کیا ہی نہیں، عملی زندگی سے کچھ کیوں نہیں سیکھتے تم لوگ؟'' میں نے اُس کی اچھی تعلیمی کارکردگی پر طنز کیا۔

''کیا فائدہ ایسے اے پلس مارکس کا اگر زندگی برتنے کا سلیقہ ہی نہ سیکھو۔'' میں کافی دل جلا چکی تھی لہٰذا کھل کر خبر لی، یہ لڑکی اپنے ہی خوابوں کی دنیا میں مست تھی۔

''چلو ساس سے تو تمہاری نہ بنی، شوہر کو کیوں اپنے ہاتھ میں نہ کیا تم نے۔'' میں نے مزید کہا، یہ سن کر تو محترمہ بھابھی صاحبہ پھٹ پڑیں۔

''مجھ سے نہیں ہوتی یہ سیاست، منافقت ..... پہلے ساس کو زچ کرو پھر پیچھے سے شوہر کو بھرو..... ویسے بھی اس معاملے میں چالیس سال کی عورت کا تجربہ بیس سالہ سے زیادہ ہی ہوتا ہے لہٰذا میں کہوں گی کہ میری چلی نہیں ویسے بھی آپ اتنی دیندار ہو کر مجھے منافقت کرنے کے مشورے دے رہی ہیں یہ کچھ سمجھ نہیں آیا؟''

''دیکھو میری پیاری بہن'' میں نے اسکا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیکر نرمی سے دبایا، ''لوگوں کے ظاہر پر فیصلے نہ کیا کرو، ویسے بھی دینداری کی ہماری سمجھ مردوں کی داڑھی اور عورتوں کے برقعے سے اوپر نہیں اٹھتی، اسلام ایک طریقہ زندگی ہے، اس طریقۂ زندگی سے تمہیں کیا حقوق ملتے ہیں اور کیا فرائض تم پر عائد ہوتے ہیں یہ میں تمہیں بتا بھی دوں تو کچھ حاصل نہیں، کیونکہ ہمارا معاشرہ جس کی لاٹھی اس کی بھینس کے قانون پر چلتا ہے یعنی جنگل کا قانون لہٰذا یہاں کاروکاری بھی چلتا ہے، قرآن سے شادی بھی، نام لیتے ہیں بلاوجہ اسلام کا.....کمال یہ ہے کہ پتا ہی نہیں اسلام کیا چیز ہے !اس بحث کو چھوڑو اور یہ بتاؤ کہ اب تم کیا چاہتی ہو؟''

''اچھا جو میں چاہوں گی وہ آپ کروائیں گی؟'' اُس نے چمک کر پوچھا مجھے ہنسی آ گئی،

''تم خاصی ہوشیار ہو، دیکھو، اللہ کا قانون تو یہ ہے کہ نسلِ انسانی کی بقا کے لئے گھر کے ادارے کی بنیاد رکھی اور گھر کے ادارے کو مضبوط بنانے کے لئے نکاح کی سنت، یعنی معاشرے کو بہترین افراد ملتے رہیں نسل در نسل لہٰذا خاندان کے اس ادارے کو مضبوط بنانا ہم سب کی ذمہ داری ہے، مقصد کو ذہن میں رکھتے ہوئے،'' میں نے مسکرا کر مزید کہا،'' اسی لئے میں یہ کسی صورت نہیں چاہوں گی کہ یہ گھر ٹوٹے۔ اب تم بتاؤ تمہارے کیا خیالات ہیں؟''

''آپ نے خود ہی جواب دیدیا اپنے سوال کا،'' اس نے طنزیہ کہا،

''ہم نے راستے کو ہی منزل مان لیا ہے، بس گھر نہ ٹوٹیں، چاہے دو نمبر نسل نکلتی رہے۔ دراصل وہ لڑکیاں جو مشترکہ خاندانی نظام میں پلتی بڑھتی ہیں یا جن کی بڑی بہنیں ہوتی ہیں انہیں عادت ہوتی ہے اس قسم کی زندگی کی، اسٹار پلس کے ڈرامے جیسی، میں بہت لمبی ذہنی جنگ نہیں لڑ سکتی، میں تھک جاتی ہوں، ہر وقت جوڑ توڑ، ہر وقت کی سیاست اس لئے میں آپ کو صاف بتا رہی ہوں کہ میں آپ کے بھائی کے ساتھ نہیں رہ سکتی۔''

اُس نے اتنا دوٹوک کہا کہ آنٹی بھی ہل کر رہ گئیں ظاہر ہے وہ بیٹی کی ماں تھیں، زمانے کے نشیب و فراز کو سمجھتی تھیں بیٹی کا ساتھ اس حد تک دینا چاہتی تھیں کہ اُس کے ساتھ صریحاً زیادتی نہ ہو جائے لہٰذا فوراً کہا۔

''اے ہے اللہ نہ کرے کیسی باتیں کرتی ہو تم عائشہ؟'' انہوں نے ڈپٹ کر کہا،'' اب ربیعہ بیٹی اتنے مان سے آ رہی ہے تو کوئی نہ کوئی بہتر حل نکلے گا، ایسے نہیں بولتے بیٹا'' انہوں نے بیٹی کی سرزنش کی۔

خالہ کا یہ کہنا گویا میرا سیروں خون بڑھ گیا، امید کی کوئی تو کرن نظر آئی۔

''نہیں امی،'' عائشہ نے مایوسی سے کہا، اس کا ہاتھ اپنے گال پر تھا ''اب سب ختم ہو گیا۔''

''اس نے تمہیں کیوں مارا'' نہ چاہتے ہوئے بھی یہ سوال میرے منہ سے نکل گیا۔

''اس دن میں حد سے زیادہ تھکی ہوئی تھی، ایک تو اس حالت میں ویسے بھی اتنی نیند آتی ہے اوپر سے امی نے کچن کی صفائی نکلوالی تھی، کھانا پکا کر پورا کچن سمیٹ کر جب تھک ہار کر میں بستر پر لیٹی تو امی نے کہا کہ ان کے دو سوٹ دھونے ضروری ہیں میں نے منع کر دیا، امی جلال میں آ گئیں، باتیں سنانے لگیں مگر میں نے کمرہ بند کر لیا۔ پھر میری آنکھ اس وقت کھلی جب حماد زور زور سے کچھ کہہ رہے تھے، امی اس دوران انہیں میری جھوٹی سچی شکایتیں لگا چکی تھیں جب میں کمرے سے نکلی تو وہ غصے سے بھرے ہوئے تھے، کہنے لگے جب امی نے کہہ دیا تھا کہ کپڑے دھو دو تو تم نے کیوں نہیں دھوئے، میں نے صفائی دینے کی کوشش کی مگر حماد کچھ سنتے بھی تو ناں! اس پر امی کے آنسو، مجھے اتنا غصہ آیا، صبح سے انہوں نے مجھے کام میں لگایا ہوا تھا اور عین حماد کے آنے پر اپنے کپڑے دھونے بیٹھ گئیں، ساتھ ساتھ کہتی جاتی تھیں، اے بیٹا میں نے کب تم سے شکایت کی تھی، بس میرے نصیب!''

یہ جملہ ویسے بھی حماد کو بھڑکانے کے لئے کافی تھا اور جب میں نے بھی کہہ دیا کہ میں کوئی نوکر نہیں (اور امی ڈرامے باز ہیں جو مجھے بعد میں حماد نے بتایا کہ اس جملے پر دماغ گھوم گیا) تو حماد نے طیش میں آ کر مجھے تھپڑ لگایا اور ہاتھ پکڑ کر گھر سے نکال دیا۔''

یہاں تک کہہ کر عائشہ خموش ہو گئی لیکن اُس خاموشی میں چھپی اذیت میں محسوس کر سکتی تھی کیونکہ ایسی ہی اذیت سے میں بھی گزری تھی دیارِ غیر میں، شوہر کو سبق سکھانے کے لئے ساس کے تعاون سے۔

(جاری ہے)

☆☆☆

نصرت یوسف

ملال

میم عینی نے سفید کاغذ پر بنی اس رنگین تصویر کو بڑی دلچسپی سے دیکھا اور پھر ''واؤ'' کہتے ہوئے علیزے بابر کے گال پر ایک خوبصورت اسٹار چپکا دیا۔ ''تمھاری جنت تو بڑی خوبصورت ہے علیزے! فادر کا کہنا ماننے پر واقعی جنت ملتی ہے۔ اس میں کھڑا فرشتہ تو بالکل تمھارا کیوٹ سا بھائی ارسل لگ رہا ہے۔''

ارسل کا نام سن کر علیزے نے اپنی منی سی ناک سکوڑی تو میم عینی نے اپنا تبصرہ روک کر ہنستے ہوئے اس کی ناک کی نوک کو دھیرے سے چھوا اور علیزے کی بنائی گئی ڈرائنگ فائل میں لگانے لگیں۔

''ٹیچر! کیا یہ میں ایک دن کے لیے گھر لے جا سکتی ہوں؟ امی ابا کو دکھانا چاہتی ہوں، میرے بابا کی ڈرائنگ بھی بہت اچھی ہے۔''

علیزے نے اپنی بنائی گئی تصویر کی پذیرائی سن کر میم عینی سے فرمائش کی تو انھوں نے دھیرے سے نفی میں سر ہلا دیا۔ ''سویٹی! نمائش کے بعد لے جانا۔ اس سے پہلے ادھر ادھر آنے جانے میں یہ خراب ہو سکتی ہے۔''

علیزے نے مطمئن انداز میں سر ہلایا اور چھٹی کی گھنٹی سنتے ہوئے آرٹ ایریا سے باہر آ گئی۔

میم عینی اردگرد رکھی فائلیں ترتیب سے رکھتے ہوئے کام سمیٹنے میں مصروف ہو چکی تھیں۔ اگلے ہفتہ پہلی اور دوسری جماعت کے بچوں کی بنائی گئی ''خوبصورتی'' کے عنوان پر بنی تصاویر کی نمائش تھی۔

بچوں کی کثیر تعداد نے اپنے اپنے تصورات کے مطابق اسکول میں میم عینی کی نگرانی میں تصویریں بنائی تھیں یہ خالصتاً بچوں کی اپنی تخلیق تھیں ورنہ عموماً بچوں کے بجائے ایسے کام ان کے سرپرست اپنے اسائنمنٹس کے طور پر کر دیتے ہیں، جس سے نوعمروں کی تخلیقی صلاحیتیں پروان چڑھ ہی نہیں پاتیں اور غیر ذمہ دار جج بھی بالغ ذہن کا کیا گیا کام معصوم ہاتھوں سے قبول کر لیتے ہیں بلکہ ستائش سے بھی نوازتے ہیں۔

میم عینی کے زیر انتظام ہونے والی اس نمائش کے لیے ننھے منے بچے اس لیے بھی پرجوش تھے کہ یکساں مواقع میسر تھے۔ جو چاہتا ان سے ڈسکس کر لیتا۔ بچے آپس میں بھی خوب خوب آئیڈیاز کا تبادلہ کر رہے تھے۔ تیاری کے لیے دیے گئے پہلے ہفتے میں علیزے کاغذ کو اپنی فائل میں رکھ کر محض سوچتی رہی اور مقررہ وقت ختم ہو گیا۔ ٹیچر نے سب سے کاغذ لے کر اپنے پاس رکھ لیے اور اگلے ہفتہ پھر دوبارہ دیے تاکہ ادھورا کام پورا کیا جا سکے۔ علیزے کی ڈرائنگ اچھی نہ

تھی لیکن وہ پھر بھی اس سرگرمی میں حصہ لینا چاہتی تھی۔ اس کی کتنی ہی دوستوں نے واقعی بہت عمدہ ڈرائنگ بنائی تھیں۔ خوبصورت سا پھول، پودا، کوئی پرندہ، کوئی ہار، سینڈریلا کے جوتے، خوبصورت گاڑی اور بہت کچھ۔ علیزے بابر کچھ بھی ان جیسا نہیں بنا سکتی تھی۔ آخر کسی خیال کے تحت اس کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ اس نے نہایت احتیاط سے رنگ اٹھائے اور اپنے کاغذ پر مصروف ہوگئی۔ آج آخری پیریڈ تھا۔ اس کے بعد میم عینی نے مکمل شدہ تصاویر کو نمائش کے لیے اپنے پاس رکھ لینا تھا۔

آرٹ ایریا میں خوشگوار سا شور تھا جو وقتاً فوقتاً ناخوشگوار چیخ و پکار میں بھی تبدیل ہو جاتا لیکن میم عینی اس کو اپنی مددگار ٹیچرز کے ساتھ کنٹرول کر ہی لیتیں۔ ایسے میں علیزے اردگرد کے ہر شور اور سرگرمی سے بے نیاز اپنے کام میں مصروف رہی۔ کچھ بہت اچھا بنتا دکھائی نہ دیتا تھا لیکن وہ بدستور لگی رہی۔ آخر جب اس نے اپنا کام ختم کیا تو آرٹ ایریا خاصا خالی ہو چکا تھا۔ اس کی دوستیں بھی جا چکی تھیں۔ یہ کھیل کا پیریڈ تھا اور اس کی پوری کلاس گراؤنڈ میں تھی۔ دوسرے سیکشن کے کچھ بچے باقی تھے۔ علیزے نے اپنی خوبصورت لکھائی میں اپنی تصویر پر ''مائی بیوٹی فل ہیون'' کا کیپشن لگایا اور دھڑکتے دل کے ساتھ ٹیچر کی جانب بڑھ گئی۔

میم عینی کی تعریف نے علیزے بابر کا حوصلہ بڑھا دیا تھا گو وہ کوئی بھی خاص ڈرائنگ نہ تھی، ہاں دیے گئے عنوان پر باقی بچوں کی تصاویر میں اس کا خیال مختلف سا تھا جس نے اس کو منفرد کر دیا تھا۔

میم عینی کے تیزی سے کام سمیٹتے ہاتھ اچانک تھم سے گئے۔ لمحہ بھر پہلے ابھری کلک کی آواز کے ساتھ ان کے دراز بالوں کو سمیٹتا کیچر دو ٹکڑوں کی صورت میں زمین پر پڑا تھا۔ ''ربش!'' کیچر کے دونوں حصوں کو آپس میں جوڑتے اسپرنگ کی کیل نکل گئی تھی۔ انھوں نے تمام ٹکڑے اٹھا کر قریبی بن میں ڈالے اور کام میں مصروف رہیں۔ کھلے بال کام کی رفتار میں رکاوٹ بن رہے تھے لہٰذا اپنے ہینڈ بیگ سے ہیئر بینڈ نکال کر انھوں نے اپنے بال اس میں کس لیے۔ اسی وقت آرٹ ایریا کے سامنے سے اسکول کے خارجی راستے کی جانب جاتے ہوئے علیزے بابر نے اپنی ٹیچر کے خوبصورت دراز بالوں میں بینڈ لگا دیکھا جس میں چمکی تتلی کے پر افشاں سے چمک رہے تھے۔ اس نے اپنے ساتھ چلتی ردا علی سیکچھ سرگوشی کی اور دونوں ٹھٹک گئیں۔

''یہاں نہ کھڑی ہوں Lovely Girls آپ کو اصول یاد نہیں؟''

میم عینی نے ان کی موجودگی محسوس کر کے دھیمی آواز میں کہا تو وہ دونوں ٹیچر کو پراشتیاق نگاہوں سے دیکھتے ہوئے آگے بڑھ گئیں جن کے خوبصورت فائل ہوئے ناخنوں پر لگا میرون نیل کلر بھلا لگ رہا تھا۔

باہر گیٹ کے قریب علیزے کا ہم جماعت عادل مشہور کارٹون کریکٹروں کے اسٹیکر اپنے دوستوں میں بانٹ رہا تھا۔ قریب سے گزرتی سائنس ٹیچر نے عادل کا کندھا تھپتھپایا اور اس کو راستے میں کھڑے ہونے سے روکا تو اس شوخ سے بچے نے ایک اسٹیکر ٹیچر کے بیگ پر بھی لگا دیا۔ ٹیچر

نے اس کو دوستانہ انداز میں گھورا اور مسکرانے لگیں۔ وہ راستے سے ہٹ گیا تھا۔''ٹیچر ایک اور؟؟'' وہ پوچھ رہا تھا۔ علیزے جو Dora کا اسٹیکر اس سے لینا چاہ رہی تھی، جواب سنے بغیر اپنے وین ڈرائیور کی جانب بڑھ گئی جو گیٹ سے اندر آ چکا تھا۔

گھر پہنچتے ہی اس نے آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر گال پر لگے میم عینی کے دیے اسٹار کو بڑے پیار سے چھوا اور اپنی پونی ٹیل کا بینڈ نکال کر بالوں میں برش پھیرنے لگی۔ بیٹی کو پکارتی ہوئی ہادیہ بابر کمرے میں داخل ہوئیں تو علیزے بدستور یونیفارم میں تھی، اس کے لچھے دار سنہری مائل بالوں میں ماں کا بڑا سا کیچر لگا تھا، انھوں نے حیرت اور دلچسپی کے ملے جلے تاثرات کے ساتھ بیٹی کو دیکھا جو شیشے میں اپنے آپ کو دیکھتے ہوئے شاید اپنی کسی ٹیچر کی نقل کر رہی تھی۔''اوہ امی جانو!'' اس نے ماں کا ابھرتا عکس آئینے میں دیکھ کر پلٹ کر کہا اور اپنے گال سے اسٹیکر اتار کر ان کے ہاتھوں پر چپکا دیا۔ ماں نے اس کی اس ادا پر مسکراتے ہوئے اس کے ہاتھ میں باتھ گاؤن تھمایا۔

'جلدی کرو شاور لے کر آؤ، آنٹی کو دیر نہیں پسند۔''

ماں کی ہدایات سن کر سات سالہ علیزے کے چہرے پر سے شگفتگی غائب ہو گئی۔ کیچر دراز میں رکھتے ہوئے وہ خاموشی سے غسل خانے کی جانب بڑھ گئی۔ ہادیہ بابر نے بیٹی کے تاثرات بغور دیکھے اور پھر اچانک تیزی سے کمرے سے باہر نکل گئیں۔

''ارسل! ارسل!'' ان کا پانچ سالہ شرارتی ترین بیٹا کہیں نظر نہ آ رہا تھا۔ پیٹرول کی بو پورے گھر میں پھیلی تھی۔ وہ بیٹے کو تلاش کرتی گھر کے کھلے حصے میں آئیں جہاں جنریٹر فکس تھا۔ وہاں وہ بچہ جنریٹر کے ٹینک میں قیف لگائے پیٹرول کی بھری ہوئی بوتل الٹ رہا تھا۔ اس کے ننھے ہاتھوں سے قیف کے باہر کتنی ہی مقدار میں پٹرول دھڑا دھڑ بہہ رہا تھا۔ ہادیہ نے تیزی سے آگے جا کر بیٹے کے ہاتھ سے بوتل تھام لی اور قریب رکھے سرخ گملے میں رکھی ریت کو فوراً ہی بہتے مائع پر الٹ دیا۔ جب خطرہ ذرا کم ہو گیا تو ارسل کو ایک آدھ جھانپڑ بھی جڑ دیا۔

''جان عذاب میں کر دیتے ہو!'' اس کو غصے سے ڈانٹتے ہوئے وہ دراصل اپنے آپ کو خوفزدہ ہونے سے بچا رہی تھی''کیا ہوتا اگر کچھ حادثہ ہو جاتا۔ اگر یہ لائٹر کچن سے لے آتا جیسا کہ اس کو شوق آتا ہے، اگر ایسا، اگر ویسا.....''

وہ ارسل کے رونے سے بے نیاز خوامخواہ اس کی نہ کی گئی شرارت پر سہم رہی تھی۔ ارسل بھی دو تین منٹ بعد خود ہی خاموش ہو گیا، وہ ایسا ہی بچہ تھا۔ خطروں سے کھیلنے والا، جی دار .....اور ماں اس قدر ہی احتیاط پسند اور حساس۔

ارسل کو صاف ستھرا کر کے جب کھانے کی میز پر وہ علیزے کے ساتھ بیٹھی تو پورے پونے تین ہو رہے تھے۔ ''امی جان میں آ کر کھانا کھالوں گی۔ آنٹی ناراض ہوں گی۔''

علیزے پر گھبراہٹ سوار ہو گئی تھی۔ ہادیہ نے بھی فکر مندی سے دیوار گیر گھڑی دیکھی، پھر گردن گھما کر بیٹے کو دیکھا جو انتہائی بے فکری سے چاولوں کے اوپر کیچپ الٹ رہا

تھا۔اس نے ایک ٹھنڈی سانس لے کر علیزے کی طرف رخ کر لیا۔ بچیاں جلد ذمہ دار ہو جاتی ہیں۔محبت بھری نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے ماں نے سوچا اور خود بھی کرسی کھسکا کر کھڑی ہو گئیں۔ بچوں کو ناظرہ قرآنی تعلیم کا وقت ہو چکا تھا۔ان کی آنٹی (استاد) کے اسکول ہی کی مانند طے شدہ اصول تھے،اور ان کی پابندی کے لیے وہ کسی نرمی کی روادار نہ تھیں۔وقت کی پابندی کے معاملے میں بھی ڈھیلا ہونا پسند نہ تھا۔ ہادیہ نے قریب رکھے نیپکن سے ارسل کا منہ ہاتھ صاف کیا اور خود سر پر اسکارف سیٹ کرتے ہوئے گاڑی کی چابی اٹھا لی۔ بچوں کو ''صنوبر ہاؤس'' کے گیٹ پر اتارتے ہوئے وہ ان کے اندر جانے کا انتظار کرنے لگی۔اتنی دیر میں خادمہ نے گیٹ کھولا اور گاڑی کے قریب آ کر ہادیہ سے کہا کہ صنوبر آنٹی نے ان کو اندر بلایا ہے۔دونوں بچے بھی سنجیدہ ترین چہروں کے ساتھ ماں کو دیکھنے لگے۔

''امی! کیوں بلایا ہے آپ کو؟''علیزے نے سرگوشی کی۔

''اندر جا کر معلوم ہو گا۔'' ہادیہ نے گیٹ کے اندر موجود رنگین طوطوں کے پنجرے کے پاس ارسل کو رکتا دیکھ کر اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے قدم بڑھا دیے۔

کمرے میں بچھے سرمئی قالین پر پانچ چھ بچے اپنی پڑھائی میں مصروف تھے۔ننھی منی پیاری سی آوازوں میں ناظرہ قرآن کی گونج نے کمرے کی ہر چیز پر سکون سا طاری کر رکھا تھا۔قریب ہی فلور کشن پر بیٹھی پر تمکنت سی صنوبر آنٹی، جو ان سب بچوں کی استاد تھیں کسی بچی سے اس کا سبق سن رہی تھیں۔ ہادیہ کی موجودگی محسوس کر کے انھوں نے نگاہیں اس کی طرف کیں اور اس کے سلام کا جواب دیتے ہوئے بیٹھنے کا اشارہ کر یا۔ ہادیہ کی ساری حسیات چوکنا ہو رہی تھیں۔ بچے، علیزے اور ارسل اپنی جگہ بیٹھ کر سپارہ پڑھنے لگے تو انھوں نے اپنا کام روک کر ہادیہ کی جانب رخ کر لیا۔

''آپ اپنے بچوں کو واپس لے جائیے، میں ان کو نہیں پڑھا سکتی۔'' استانی کا یہ جملہ سن کر دونوں بچے بھی سہم سے گئے تھے۔ ہادیہ کی سمجھ میں نہ آ رہا تھا کہ یہ برہمی کس بات پر ہے۔اچانک اس کی نظر علیزے کے ہاتھ پر گئی ''اوہ! نیل کلر''۔

صنوبر آنٹی نیل پالش کے سخت خلاف تھیں کیونکہ اس سے وضو نہیں ہو پاتا۔تیزی سے آئے خیال نے ہادیہ کو یقین دلا دیا کہ اصول تسلیم نہ کرنے پر استاد کی ناراضگی ہوئی ہے۔ اس سے پہلے پچھلے ہفتہ ہی ارسل کو کارٹون کیریکٹر Ben10 والی چپل پہننے پر وہ سرزنش کر چکی تھیں۔

''بہت معذرت، میں اتنی جلدی میں آئی ہوں کہ.....'' وہ جلدی جلدی وضاحتیں دینے لگیں۔نیل کلر پہ صفائیاں دینی بالکل بیکار تھیں۔وہ بوکھلاہٹ میں بھول گئی تھی کہ اس کا بلاوا تو گیٹ پر ہی آ چکا تھا۔علیزے نے بھی بے اختیار اپنی انگلیاں موڑ لیں تھیں۔سب بچے اپنی اپنی پڑھائی چھوڑ کر ہونے والی گفتگو کو سمجھنے کی کوشش کر رہے تھے۔صنوبر آنٹی نے ہادیہ کی بات پر کوئی تاثر نہیں دیا۔خفت کے مارے اسے تپش کا احساس ہونے لگا حالانکہ کمرہ خوب روشن اور ہوادار تھا۔

''آپ لوگ بچوں کو قرآن پڑھانے کے معاملے میں سنجیدہ نہیں۔ آج دو دن بعد بچے آئے ہیں۔ ایسے کیسے پڑھائی ہوگی، کبھی تصویریں آ رہی ہیں، کبھی نیل پالش لگی ہے، کبھی وقت پر نہیں آتے تو کبھی علیزے کو میں جینز پہنا دیکھتی ہوں۔''صنوبر آنٹی کی آواز میں واضح خفگی تھی۔

''اسکول کے اصول پر تو آپ لوگ 'سمعنا و اطعنا' کرتے ہیں جبکہ قرآن کے لیے اس قدر غیر ذمہ داری کا رویہ! معاف کیجیے میں بچوں کو اس طرح نہیں پڑھا سکتی۔''

''ایک دن کی چھٹی کی تو میں نے آپ سے پہلے ہی اجازت لی تھی۔کل مجھے بخار تھا، میں ڈرائیونگ کی بالکل ہمت نہیں کر پا رہی تھی۔'' ہادیہ بابر نے دھیمی آواز میں وجہ بیان کی تو صنوبر آنٹی نے قریب رکھا چشمہ آنکھوں پر لگا کر سیرت کی کتاب کھول لی۔

''آپ سے اصول نبھ نہیں پاتے، مجھ سے ایسے طریقے .....'' یہ جملہ اختتامیہ کہہ کر گویا انھوں نے ہادیہ کو روانہ ہونے کا اشارہ کر دیا۔ان کی جلالی سرزنش سے اس کا حوصلہ خاصا پست ہو رہا تھا، وہ بچوں کو لے کر مرے مرے قدموں سے باہر نکل آئی۔بچوں اور ماں نے گھر پہنچ کر اس واقعے سے متعلق کوئی بھی بات نہ کی۔ ہادیہ کو خفت اور شرمندگی کا احساس ہو رہا تھا۔علیزے نے بیڈ پر لیٹی ماں کے پاس آ کر دھیرے سے کہا''امی کیا قرآن میم عینی نہیں پڑھا سکتیں؟ وہ کسی پر غصہ نہیں کرتیں اور اسٹار بھی دیتی ہیں۔''

اس کی یہ بات سن کر ہادیہ نے تڑپ کر آنکھیں کھول دیں۔جڑے ہوئے نیلم اور زرقند سے بنی صلیب پہنے کرسچن عینی سموئیل کے اخلاق نے معصوم دل و دماغ میں قرآن جیسی عمدہ اور اعلیٰ ترین کتاب کا سبق بھی اعلیٰ ترین اخلاق کے ساتھ دیکھنے کی تمنا کر ڈالی تھی۔کیا المیہ ہے کہ نسخۂ شفا کے حامل صالحیت کے درجے پر بیٹھ کر صلاحیت پر توجہ ہی نہیں دیتے! اپنی ذات کو بلند رکھتے نفس، دلوں کو تسخیر کرنے کا گر ہی نہیں سیکھ پاتے! ہادیہ کی آنکھیں نم ہوتی چلی گئیں اور ملال اس کے اندر پھیلتا چلا گیا۔

بشریٰ تسنیم

شام وسحر تازہ کریں

شہر سے باہر نئی کالونی کی ایک حویلی کے وسیع وعریض لان میں عبدالرحیم مرزا، مسجد سے واپس آ کر صبح کی ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا میں گہرے گہرے سانس لینے کی مشق کر رہے تھے ۔کئی رنگ کے گلاب اور پھولوں کی شاندار ترتیب کے ساتھ سجا ہوا لان عجب بہار دے رہا تھا۔ چڑیوں اور دیگر ننھے منے پرندوں کی آوازیں، دنیا کی کسی بھی موسیقی سے بدر جہا بہتر محسوس ہو رہی تھیں۔ درختوں کی ٹہنیاں نرمی سے جھول رہی تھیں جیسے ماں اپنے بچے کو ہولے ہولے جھولا دے رہی ہو۔عبدالرحیم مرزا نے موبائل سے سورہ الرحمٰن کی تلاوت لگا دی۔قاری کی خوش الحانی نے منظر کا حسن دوبالا کر دیا۔

''تم اپنے رب کی کون کون سی نعمتوں کو جھٹلاؤ گے؟''

گہرے سبز گھاس کی شبنم پہ ننگے پاؤں چلتے ہوئے عبد الرحیم مرزا نے اقرار کیا کہ وہ کسی نعمت کو نہیں جھٹلا سکتے ۔ سماعت، بصارت اور دل کا احساس اپنے رب کی نعمتوں کا انکار کیسے کر سکتا ہے؟ ہوا کا کوئی شریر سا جھونکا سارے باغیچے کے پھولوں کو چھیڑتا ہوا، سب خوشبوؤں کو یکجان کر کے لے بھاگتا اور عبدالرحیم مرزا کو گہرا سانس لے کر خوشبو اپنے اندر اتارنے کی دعوت دیتا۔ وہ اس دعوت کو قبول کرتے اور تازہ دم ہو جاتے ۔تقریباً 75 سالہ مرزا عبدالرحیم کا یہ روزانہ کا معمول تھا۔ اس باغیچہ میں لگے پھولوں کی خوشبو ان کو اپنی زندگی کے ہر ماہ، سال پہ پھیلی محسوس ہوتی ۔ پھولوں کا رنگ اور مہک ہر جگہ ایک ہی رہتی ہے۔ ساتھ گل ریحان ہو تو کیا ہی بات ہے۔ وہ آتے جاتے اس پودے کو چھیڑ جاتے اور اس کے ساتھ ہی ان کو بہت سی خوشبو بھری یادیں بے چین کر دیتیں۔

سورہ الرحمٰن کی تلاوت ختم ہو گئی تو وہ ایک گہرے احساس سے باہر آ گئے ۔شکر ہے اللہ! تو نے آنکھیں، کان اور شعور سلامت رکھا ہے۔ میں کس کس نعمت کا شکر ادا کروں ؟ ٹہلتے ٹہلتے وہ باغیچہ کی کرسی پر آن بیٹھے ۔آنکھیں موند کر اُسی خالق و مالک کے حضور اپنی ندامتوں کو پیش کرنے لگے ..... 75 سال میں سے بارہ تیرہ سال نکال دیں بچپن کے، تو باقی کتنے سال، مہینے، ہفتے اور دن گزر گئے؟ غفلت کی نذر ہو گئے ؟ اللہ نے سانسیں گن کر عطا کی ہیں یہاں سانسوں کا حساب کون رکھتا ہے؟ ہر سانس جو اندر جاتی ہے اور سلامت واپس آتی ہے، یہ ہی کتنی بڑی نعمت ہے۔ اگر اس ایک نعمت کا حساب ہی مانگ لیا تو ..... ؟اے میرے رب ، مجھے بغیر حساب کے قبول کر لیجو، کتنی بڑی دعا کتنی آسانی سے کہہ دی تم نے عبدالرحیم مرزا.....

''مگر اللہ رب العزت کے لئے کیا مشکل ہے؟'' خود ہی جواز بھی تلاش کر لیا انہوں نے .....

''عبدالرحیم مرزا! صرف دعا سے کام نہیں چلتا، دوا بھی کرنا پڑتی ہے'' انہوں نے خود کو سمجھایا۔

ملگجے اندھیرے کا تاثر آہستہ آہستہ کم ہو رہا تھا۔ رنگ اور خوشبو میں سے رنگ نمایاں ہونے لگے تھے جیسے کوئی سرمئی رنگ کا باریک دوپٹہ منظر سے ہٹا دے۔

گلِ ریحان اور گلاب و چنبیلی کا ملا جلا ہوا کا جھونکا ان کے چہرے کو چھوتا ہوا گزرا اور ایک نرم سی سرگوشی ان کے کانوں سے ٹکرانے لگی۔ ان تینوں خوشبوؤں کے ساتھ ''شیریں'' کا تصور نہ ہو یہ کیسے ممکن ہے؟ انہوں نے زیرِ لب دہرایا ''شیریں'' اور خود ہی مسکرانے اور کچھ گنگنانے لگے۔

مرزا جاوید عبدالرحیم چائے کی پیالی پکڑے لان کی طرف آ رہے تھے۔ کرسی پہ بیٹھے ابا جان کو آنکھیں موندے مسکراتے گنگناتے دیکھا تو بے اختیار وہ بھی مسکرانے لگے .....ہلکی سی آہٹ پہ مرزا عبدالرحیم نے آنکھیں کھولیں اور جھینپ گئے ..... ''آؤ۔ آؤ، بیٹا جیتے رہو'' ساتھ ہی انہوں نے سلام کا جواب دیا.....مرزا جاوید نے پیالی باپ کو پکڑائی اور گہرے گہرے سانس لے کر تازگی اپنے اندر اتاری.....

''آج چائے کو طبیعت نہیں آمادہ''

''ابا جان! آپ کی طبیعت کیسی ہے؟'' مرزا جاوید نے گھبرائے لہجے میں پوچھا۔

''بیٹا! طبیعت تو الحمدللہ ٹھیک ہے، بس ویسے ہی دل نہیں چاہ رہا گرم چیز پینے کو، موسم بدل رہا ہے نا!''

''کچھ ٹھنڈا لا دوں؟''

''نہیں، یہ دیکھو، پانی ہے نا! ابھی پیا ہے۔'' انہوں نے منرل واٹر کی چھوٹی بوتل کی طرف اشارہ کیا جو پہلو میں رکھی تھی۔ اور بیٹے کو محبت سے دیکھا۔

''اچھا!'' جیسے آپ کی طبیعت چاہ رہی ہو، وہی بہتر ہے''

دونوں باپ بیٹے میں عمروں کا تفاوت کچھ زیادہ نہ تھا۔ مرزا عبدالرحیم خوش لباس، زندہ دل، صحت مندی کا رجحان رکھنے والی شخصیت کے مالک تھے۔ پھر دونوں میں صرف بیس سال کا فرق تھا۔ پہلے پہلوٹھی کی اولاد اور والدین میں کم و بیش اتنا ہی فرق ہوتا تھا۔ اکثر لوگ تو ان کو ایک دوسرے کا بھائی ہی سمجھتے تھے۔

ہر موضوع پر کھل کے بات کرنے اور بے تکلفی کے باوجود باپ کا حد درجہ احترام ان کی شخصیت کا خاصہ تھا۔ اس وقت بھی بیٹا، باپ کی طبیعت، رجحان، انداز کو دیکھ کر اندازہ لگا چکا تھا کہ آج ابا جان کا موڈ زیادہ بات چیت کرنے کا نہیں ہے.....وہ باپ کے سامنے خاموش موڈ ب بیٹھے رہے۔

مشرق سے سرمئی اور سرخ رنگ کی ملی جلی دھاریاں نظر آ رہی تھیں، کہیں کہیں کرنیں بھی اپنا وجود منوانے کو کوشاں تھیں۔ چڑیوں کی چہکار ختم ہو رہی تھی۔ وہ صبح کی مناجات کے بعد اپنی ''روزی روٹی'' کے چکر میں گھروں سے روانہ ہو چکی تھیں۔

باہر کبھی کبھار موٹر سائیکل کے گزرنے کا شور۔ بائیسکل کی ٹن ٹن۔ گاڑی کا گزرنا، ماحول کے سکوت کو توڑ دیتا تھا۔ اسی اثنا میں باہر سے اخبار اڑتا ہوا آیا اور مرزا عبدالرحیم کے سر کو چھوتا ہوا گود میں جا گرا.....ساتھ عینک بھی تھی تو محویت

ٹوٹ گئی .....اور چونک کر انہوں نے اپنی عینک اور اخبار کو گود میں پڑے دیکھا.....

ٹھنڈے مزاج کے پرسکون رہنے والے مرزا عبد الرحیم کو آج نہ جانے کیوں ناگواری نے دبوچ لیا..... ہر انسان جب تنہائی چاہتا ہے تو مداخلت کا ہر پہلو ناگوار ہی لگتا ہے۔

''احمق''..... ناگواری سے منہ سے نکلے ہوئے لفظ کے ساتھ ہی انہوں نے اپنا منہ اپنے ہاتھ سے بند کر لیا۔ شرمندگی اور ندامت کا احساس فوراً چہرے پر نمایاں نظر آنے لگا۔احساسِ ندامت کا یہ پرتو انہوں نے ''شیریں'' سے غیر محسوس طریقے پر اپنا لیا تھا.....

مرزا عبد الرحیم کی یہی وہ خوبی تھی کہ وہ کسی بھی غلطی پہ فوراً چونک جاتے اور ندامت محسوس کرتے ۔ پیمان ہوتے .....اس کی تلافی کرنے کی کوشش کرتے۔

''لو، بھلا اس کا کیا قصور؟..... میں نے خوامخواہ اس کو بُرا کہا ہے نا!''انہوں نے بیٹے کی طرف دیکھا،

''ابا جان ! آپ اتنی سی بات پہ کیوں پریشان ہوتے ہیں۔آپ نے کچھ زیادہ بُرا تو نہیں کہا۔ یہ تو عام سی بات ہے ۔''تسلی آمیز لہجہ بھی ان کو شانت نہ کر سکا۔مگر پھر بھی ..... وہ سوچوں میں کھونے لگے،تو بیٹے نے باپ کے ہاتھوں پر ہاتھ رکھ دیئے ..... ابا جان! آپ اتنی معمولی سی باتوں پر خود کو ہلکان نہ کیا کریں۔''

مرزا عبد الرحیم کو اپنی چھوٹی سی غلطی پر اپنی ساری گزشتہ غلطیاں یاد آنے لگتیں اور ساتھ کون ،کون نہیں یاد آتا تھا.....غفلت کا ہر پل اور پھر وہ غفلت بھرا وقت .....انہوں نے سر جھٹکا جیسے پرانی یادوں کو جھٹک رہے ہوں.....

ابھی بھی انہوں نے مداوا سوچا کہ کل اخبار والے کو بلا کر اس کو چائے پلائیں گے اس کی ہمت ،محنت اور پابندئ وقت کی تعریف کریں گے۔کوئی انعام دیں گے۔''

سورج منڈیر سے جھانک رہا تھا۔اُس نے شہر کا جائزہ لیا۔سڑکوں گلیوں میں رونق برائے نام تھی۔گھروں میں بھی کوئی خاص چہل پہل نہ تھی۔دفتروں اور تعلیمی اداروں میں جانے والے آج چھٹی منا رہے تھے۔سورج نے چند لمحے یہ سب مناظر دیکھے اور پھر منڈیر پھلانک کر میدان میں اتر آیا .....اس کا پورا رخِ روشن دنیا والوں کی طرف تھا۔اس کو اس سے کیا کہ کس کی چھٹی ہے اور کون کب اٹھتا ہے؟ اس کی چھٹی کا دن ابھی نہیں آیا.....وہ اپنی ڈیوٹی پہ حاضر ہو گیا۔

مرزا جاوید نے باغیچہ کا جائزہ لیا۔سورج کے مکمل طور پر افق پر چھا جانے سے باغیچے کا ملکوتی حسن ماند پڑنے لگا .....دودھیا سی نیلگوں روشنی میں ہر پھول خوش باش، ہنستا ہوا نظر آ رہا تھا.....تیز روشنی سے جیسے آنکھیں چندھیا جاتی ہیں، پھول بھی گریزاں گریزاں سے نظر آنے لگے تھے،

''ابا جان ! کمرے میں چلیں؟'' آج تو دھوپ ابھی سے کاٹنے لگی ہے''

''چلو، چلتے ہیں۔''

باپ کے ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر وہ کمرے کی طرف جانے لگے ان کو ابھی بھی لگا، وہ ننھا سا بچہ ہیں اور ابا جان کی انگلی پکڑ کر بے فکری سے جا رہے ہیں۔

''یا اللہ! میرے ابا جان کا سایہ ہمارے سروں پر تا دیر رکھنا''

برآمدے کی چند سیڑھیاں چڑھتے ہوئے انہوں نے دعا کی۔ساتھ ہی اپنی والدہ مرحومہ کی یاد نے ان کو اداس کر دیا.....

''یا رب! میری والدہ کو جنت کے سب سے اعلیٰ درجہ میں رکھیئو'

ایک سرد آہ کے ساتھ انہوں نے دل کی پکار،خود ہی سنی .....ایک خاموشی دونوں میں حائل تھی جب وہ مرزا عبدالرحیم کے کمرے میں داخل ہوئے۔

خوب صورت،صاف ستھرا،قیمتی فرنیچر سے آراستہ کمرہ جس کی کھڑکی باغیچہ میں کھلتی تھی اور جس کا اندرونی دروازہ مرزا جاوید کی خواب گاہ کی طرف تھا ..... بالکل ایسے جیسے والدین اپنے بچوں کے کمرے کا دروازہ اپنے کمرے سے منسلک رکھتے ہیں۔واقعی مرزا عبدالرحیم بہت خوش قسمت تھے ان کا بیٹا ، بہو، دو بیٹیاں ، داماد ہر دم دل جوئی میں لگے رہتے ۔ ہر پہر ان کو رفاقت کا احساس دلاتے .....سب ان کی خوشی ، احساسات ،ضروریات، جذبات کا خیال رکھتے .....اگرچہ اگلی نسل اور والدین ایک دوسرے سے شاکی شاکی رہتے تھے۔

''ابا جان ! ناشتہ کب کریں گے؟.....اور طبیعت کس چیز کو چاہ رہی ہے؟'' مرزا جاوید نے باپ کو بستر پر بٹھاتے ہوئے محبت سے پوچھا۔

ابھی تو کچھ نہیں دل چاہ رہا.....آج چھٹی ہے نا! بچے آرام سے اٹھیں گے تب تک میری طبیعت بھی کچھ نہ کچھ ارشاد فرما ہی دے گی۔زندہ دلی کے ساتھ یہ جملہ کہتے ہوئے انہوں نے بیٹے کو بھرپور مسکراہٹ کے ساتھ دیکھا۔جواباً بیٹے نے ہلکا سا قہقہہ لگا کر باپ کی زندہ دلی کی داد دی۔

''جاوید! اخبار پکڑا دو جب تک۔'' انہوں نے بستر سے ٹیک لگاتے ہوئے کہا۔

''جی۔'' اخبار پکڑا کر جاوید نے باہر کا رُخ کیا۔ وہ جان گیا تھا تنہا رہنا چاہتے ہیں۔مرزا جاوید کے جاتے ہی انہوں نے اخبار رکھ دیا.....اور آنکھیں موند لیں، جاوید نے واپس مڑ کر دروازے سے اپنے باپ کی کیفیت دیکھی اور جان گئے کہ آج پھر ڈپریشن ہونے لگا ہے ..... سارے گھر والے جس کو''ڈپریشن'' کہتے تھے .....مرزا عبدالرحیم اس کو'' خود احتسابی' کہتے تھے۔

آنکھیں موندے، موندے انہوں نے محسوس کیا کہ کمرے میں گلاب چنبیلی اور گل ریحان کی خوشبو پھیل گئی ہے ۔ضرور فیض گلدستہ بنا کر لایا ہوگا اس خوشبو کے ساتھ ہی ''شیریں'' کا تصور غالب آنے لگا۔وہ زیر لب گنگنانے لگے ۔

آج وہ دل ہے قفس،اندر قفس اندر قفس
جو کبھی گلزار در گلزار در گلزار تھا۔

☆.....☆.....☆

چودھویں کا چاند پوری آب و تاب سے روشن تھا۔مرزا عبدالرحمٰن کی حویلی کے پچھلے صحن میں قطار میں چار پائیاں بچھی تھیں۔جن پہ سفید چادریں چاندنی کو جذب کر کے مزید

نمایاں کر رہی تھیں ۔ کیاریوں میں لگے گلاب ، چنبیلی، گل ریحان اور رات کی رانی کی خوشبو ماحول پہ چھائی ہوئی تھی ..... یہ زنان خانے سے منسلک صحن تھا جہاں گرمیوں میں عورتیں ،لڑکیاں سویا کرتیں ،سردیوں میں دھوپ تاپتیں ۔ مردوں کا اس طرف آنا کافی اچنبھے کی بات ہوتی تھی ۔ لڑکیاں صحن میں شیشم کے درخت پر جھولا ڈال کر مزے سے جھولتیں ۔ برآمدے میں بچھے تخت پہ دادی جان اپنے پاندان سمیت موجود بچیوں کی طرف سے غافل نہ ہوتیں اور کام کرنے والیوں پر بھی نظر رکھتیں ۔

تہذیب ،سائستگی ،سادگی جس میں مرعوب کر دینے والا وقار شامل تھا اس گھرانے کا خاصہ تھا بلکہ وہ دور ہی انسانی تہذیب وشائستگی کا علمبردار تھا ، بچے اطاعت گزار ، خدمت کی حس رکھنے والے ، بزرگ محبت وشفقت کا نمونہ .....مرزا عبدالرحمٰن کے آباواجداد اشراف عرب سے تعلق رکھتے تھے ۔کسی زمانہ میں وہ ایران آئے اور پھر انہوں نے دہلی کو اپنا مسکن بنایا۔ ہر مقام کا تہذیب وتمدن اپنی شان کے ساتھ ان کے گھرانے میں رچ بس گیا تھا .....مختلف مقامات پہ رہنے اور سفر در سفر کرنے والی قومیں اور خاندان بہت سی نئی چیزیں اختیار کرتے ہیں تو بے شمار چیزیں منظر سے غائب بھی ہونے لگتی ہیں ..... بچوں کی شکلیں ، عادات ، مزاج کسی حد تک تبدیل ہوتا جاتا ہے ..... زندگی کا رکھ رکھاؤ ..... کتر بیونت کا شکار ہو ہی جاتا ہے .....ابھی ان کے خاندان میں اچھائی کے پہلو زیادہ تھے ۔

مرزا عبدالرحمٰن اپنے سات بچوں کے ساتھ اس حویلی میں اپنے دادا کے زمانے سے رہ رہے تھے اور اب وہ خود کئی بچوں کے دادا اور نانا تھے ۔

اُس چاندنی رات میں مرزا عبدالرحمٰن نے زنانہ صحن میں اترنے سے پہلے برآمدے میں کھڑے ہو کر چق کے پیچھے سے کھنکار کر اپنی موجودگی کا احساس دلایا ..... چار پائیوں پہ بیٹھی لڑکیوں اور عورتوں نے سلیقہ سے اوڑھے ہوئے دوپٹوں کو مزید درست کر کے تسلی کی چھوٹی لڑکیاں دادا جان آ گئے ، کہتے ہوئے بھاگ کر چق کے پاس جا پہنچیں ۔ دادا جان کبھی کبھار ادھر آ کر حال احوال پوچھ جاتے تھے..... انہوں نے بچیوں کے سر پہ دستِ شفقت رکھا ، بہوؤں اور باقی لڑکیوں نے آ کر ادب سے سلام کیا ۔ انہوں نے اپنی بڑی بہو حمیدہ بیگم اور اپنی بیگم ''احمدی بیگم'' کو مردانہ صحن میں آنے کو کہا ۔ حویلی کا اگلہ حصہ مردانہ تھا جس کے صحن میں چار پائیاں سفید چاندنیوں کے ساتھ ویسا ہی منظر پیش کر رہی تھیں ۔ ایک ہی چاند مختلف مقام کو یکساں روشنی میں نہلا رہا تھا ۔ مردانہ صحن کے ساتھ چھوٹا سا باغیچہ چاندنی میں بہت رومانوی ماحول کا تاثر دے رہا تھا ۔ دادی اور والدہ کے جانے کے بعد سب لڑکیوں اور دیگر بہوؤں نے کھسر پھسر شروع کر دی کہ'' آج کچھ نیا ہونے والا ہے ۔''

وہ ''نیا'' مرزا عبدالرحیم کے ساتھ ہونے جا رہا تھا ۔ دادا جان کے فیصلے اٹل ہوتے تھے اور باپ کی موجودگی میں بیٹوں کو اپنی اولادوں کے بارے میں فیصلے کرنے کا حوصلہ تھا نہ روایت ..... باہمی اعتماد اور محبت کی فضا میں رہنے والے ایک دوسرے سے اس طرح جڑے رہتے جیسے تسبیح کے دانے

۔علیحدہ علیحدہ ہوتے ہوئے بھی ایک دھاگے اور ''امام'' سے منسلک رہتے ہیں۔

ہلکی ہلکی ہوا چل رہی تھی۔عشاء کی نماز کے بعد مرزا عبدالرحمٰن اپنے تین بیٹوں مرزا عبدالخالق۔مرزا عبدالقادر اورمرزا عبدالحنان کے ساتھ موجود تھے۔مرزا عبدالرحیم کو خاص طور پر بلوایا گیا تھا۔جو مرزا عبدالرحمٰن کا پہلا پوتا اور مرزا عبدالحنان کا اکلوتا بیٹا تھا۔

مرزا عبدالرحیم کی والدہ اور دادی کے آنے پر سب احترام سے کھڑے ہو گئے اوران کو مناسب جگہ پہ بیٹھنے میں مدد کی۔

دادا جان سفید کرتا پاجامہ پہنے چاندنی میں ماحول کا لازمی حصہ لگ رہے تھے۔ باقی مردوں نے بھی سفید پاجاموں کے ساتھ ہلکے رنگوں کے کرتے پہن رکھے تھے۔ بڑوں کے سامنے سر سے ٹوپی اتارنا تہذیب کے خلاف تھا۔ سب اپنے باپ کی طرف سے کچھ بولنے کے منتظر تھے۔ دونوں خواتین اندر سے کچھ سہمی سی لگ رہی تھیں اور سب سے زیادہ بُرا حال مرزا عبدالرحیم کا تھا.....اس طرح کی پیشی کا مطلب کوئی ناروا حرکت سرزد ہو جانے کی کہیں سے اطلاع مل جانا ہوتا تھا،مرزا عبدالرحیم گزشتہ دنوں،ہفتوں کا احتساب کرنے میں لگے ہوئے تھے۔ محلے کے بزرگ، چھوٹے بچے،استاد،دوست احباب کہیں کچھ مجھ سے غلط ہوا ہوگا، کیونکہ وہ سارے بچوں میں زبان کے تیز اور غصہ ور گردانے جاتے تھے.....دادی جان اکثر کہتی سنائی دیتیں۔

''عبدالرحیم ! خدا کا خوف کرو، زبان اور جذبات کو قابو میں رکھو''

مگر ان کو کچھ ایسا یاد نہ آیا جس پہ یوں خاص طور پر عدالت لگائی جانا ضروری ہو۔

''نصف صدی پہلے کی شرارتیں، بدتمیزیاں،غصہ آج کے دور میں تہذیب،اعتماد اور شرافت سمجھی جاتی ہے''

آج مرزا عبدالرحیم اپنے کمرے میں بستر پر لیٹے چھت کو تکتے ہوئے سوچ رہے تھے۔تہذیب وتمدن نے چند دہائیوں میں کتنے سمندر وصحرا عبور کر لیے ہیں۔آج جو خوب ہے وہ کبھی نا خوب ہوا کرتا تھا۔میری زبان جو تیز اور کٹیلی سمجھی جاتی تھی۔آج اُس کے مہذب ہونے کی مثالیں دی جاتی ہیں.....

بزرگوں کے سامنے سر اٹھا کر آنکھ سے آنکھ ملا کر بات کرنا،کوئی تہذیب نہ تھی۔نشست وبرخواست،کھانا پینا،ہنسنا بولنا،گھروں میں آنا جانا ہر بات ہر کام کا سلیقہ ہوتا تھا۔آج ان کے پوتے نواسے بھی موجودہ معاشرے میں ایک مثالی کردار سمجھے جاتے ہیں۔مگر وقت کی اڑان کے ساتھ بہت کچھ ہوا ہو گیا ہے۔احساس مروت کو کچل دیتے ہیں آلات، مشینی دور ہے اور شریف سے شریف اور مہذب گھرانے کا حال اُس دور کے جاہل وکمتر گھرانے سے بھی بدتر ہو گیا ہے اشرافیہ کا مفہوم کچھ سے کچھ ہو گیا۔لڑکے لڑکیوں کی باہم بے تکلفی لباس سے بے پرواہی.....اُس دور کے نوجوان لڑکے کتنے حیادار تھے آج کی نوعمر بچی میں بھی وہ حیا باقی نہیں رہی .....

مرزا عبدالرحیم نے پہلو بدلا .....اور شکر کیا کہ وہ کسی

اچھی روایت کا حصہ رہے ہیں.....مگر ابھی کیا کچھ بہا کر لے جائے گا یہ سیلابِ بلا..... بلکہ ہر گھر میں ایسا سیلاب آ گیا ہے جس کے آگے بند باندھنا صدیوں کا زمانہ مانگتا ہے۔فراز سے نشیب میں آنا کتنا آسان ہے اس میں کتنا کم وقت لگتا ہے۔اخلاقی بلندیوں کے پہاڑ کو سر کرنا کتنا مشکل ہے۔

مرزا عبدالرحیم کی سوچیں کہاں سے کہاں جا بھٹکتیں اگر صفائی کرنے والا نہ آتا ..... انہوں نے ایک نظر اُس کو دیکھا اور چادر سر پہ تان کر لیٹ گئے اُسی اثنا میں پیتل کا گلدان زمین پہ گرا..... پھول بکھر گئے۔خوشبو کا ایک جھونکا کھڑکی سے آتی ہوا نے ان تک پہنچایا..... ملازم شرمندہ سا ہو کر پھول جمع کرنے لگا۔مرزا عبدالرحیم نے اُس کی تشفی کراتے ہوئے کہا۔

''گلدان گرنے کی آواز سے بہت اچھا جلترنگ بجا تھا۔''

اُس جل ترنگ کی آواز میں شیریں کی ہنسی شامل ہوگئی اور ساتھ ہی ان کو یاد آیا کہ وہ یادوں کے سفر میں وہاں تک پہنچے تھے جب دادا جان کے سامنے ان کی پیشی ہوئی تھی.....

دادا جان نے ایک نظر سب پہ ڈالی اور کھنکار کر بات شروع کی۔

''برخوردار عبدالرحیم نے''.....انہوں نے عبدالرحیم کی طرف رُخ کیا تو نوعمر عبدالرحیم کا دل زور سے دھڑکا۔ ماں کی ہتھیلیوں پہ پسینہ آ گیا، جانے کیا کہنے والے ہیں۔ باپ نے بھی اپنی نگاہیں عبدالرحیم پہ ٹکا دیں..... ماحول پہ سکوت غالب آنے لگا۔جھینگر اور مینڈک کی دور سے آتی آواز صاف سنائی دے رہی تھی.....

چند سکینڈ کی خاموشی کتنی طویل محسوس ہو رہی تھی۔

''علی گڑھ جانے کی خواہش ظاہر کی ہے''..... اوہ! عبدالرحیم نے سکون کا سانس لیا۔وہ تو بھول ہی گئے تھے کہ گزشتہ مہینے انہوں نے باقاعدہ تحریری درخواست دادا جان کے حضور پیش کی تھی۔کوئی جواب نہ پا کر وہ تو بھول ہی گئے تھے.....

اب یاد آنے پر اس بات کی بے چینی لگ گئی کہ جواب کیا ہوگا؟

''ہاں بھئی! عبدالحنان! آپ کا کیا خیال ہے؟ علی گڑھ کالج میں اس کو بھیجا جائے؟''

''ابا جان! جیسے آپ مناسب خیال کریں۔''

''ویسے تو اکلوتے بیٹے کو کاروبار میں ہی ہاتھ بٹانا چاہیے، لیکن میں نے کافی غور کیا ہے کہ دو چار سال کے لئے بھیجنے میں کوئی حرج نہیں۔اس کو شوق بھی ہے اور علی گڑھ کالج کے پروفیسر میرے دیرینہ دوست علی حیدر نے بھی سفارش کی ہے کہ نوجوانوں کو تعلیمی میدان میں آگے آنا چاہیے۔''

''جی بہتر''.....عبدالحنان جیسے اپنے باپ اور اپنے بیٹے کے درمیان رابطے کا کام کر رہے تھے۔مرزا عبدالرحیم کے دل میں خوشی سے لڈو پھوٹنے لگے۔لیکن بڑوں کی محفل میں بیٹھنے کے آداب میں وہ اپنی جسمانی کیفیت کے ساتھ زبان کو بھی قابو میں رکھے ہوئے تھے۔''مگر ایک شرط ہے .....''

''یا اللہ! خیر! وہ کیا شرط ہوگی''.....کسی کو پوچھنے کی

ضرورت نہ تھی ۔ سب کو معلوم تھا وہ شرط جیسی بھی ہو گی ماننی پڑے گی ۔

''عبدالرحیم کا رشتہ غلام فاطمہ کی بیٹی شیریں سے طے کر دیا ہے ۔علی گڑھ روانگی سے پہلے باقاعدہ نسبت طے کر دی جائے گی ۔''

دادی اماں نے خوشی سے ماشاء اللہ کہا ۔ اماں جی خاموش رہیں چچا مسکرائے اور والد نے بھی اثبات میں سر ہلا دیا..... گویا سبھی راضی تھے ۔عبدالرحیم کی ٹھوڑی مارے شرم کے سینے سے لگ گئی ۔

نوعمر عبدالرحیم جس کے ہونٹوں پہ سرمئی لکیر ابھی واضح نہ ہوئی تھی اور آواز کا زیر و بم کنٹرول سے باہر ہونا شروع ہی ہوا تھا..... کسی سرخوشی سے بے نیاز سا رہا ۔ سر جھکائے اُس نے پھوپھی زاد 'شیریں'' کا تصور باندھنے کی کوشش کی لیکن کوئی شبیہ نگاہوں میں نہ بن سکی..... اُسے تو علی گڑھ جانے کی اجازت ہی سب سے بڑی خبر لگ رہی تھی ۔

میٹرک کا رزلٹ آیا تو دونوں کاموں کی تیاری شروع ہوگئی ۔علی گڑھ جانا ،اور منگنی کی رسم ادا کرنے کیلئے بزرگوں کا لاہور جانا ۔عبدالرحیم کی دو پھوپھیاں لاہور میں تھیں ، ایک دہلی میں اور ایک علی گڑھ میں ۔ان سب کا ایک ساتھ جمع ہونا سالوں بعد ہوتا تھا.....

عبدالرحیم کے دل میں ایک دو بار دبی دبی سی خواہش ابھری کہ وہ شیریں کے بارے میں کسی سے سوال کرے مگر حجاب مانع رہا ۔ باوجود کوشش کے وہ شیریں کا تصور نہ باندھ سکے تھے ۔کوئی بھی واقعہ ان کے ذہن میں نہ تھا ۔ پھر چھوٹی چچی نے مسئلہ حل کر دیا.....عبدالرحیم ! وہ تو بس یہی گایا کرے گی'' آتا ہے یاد مجھ کو گزرا ہوا زمانہ.....'' اوہ ! یہ وہ ہے بے اختیار عبدالرحیم مسکرائے ۔کم سن سی لڑکی ، تیل چپڑے بالوں کی کس کے کی ہوئی دو چوٹیاں مُندی مُندی سی آنکھیں ۔ پھولے پھولے گال اور سانولا سا رنگ.....جھولے پہ بیٹھی چیخ کر''گزرا زمانہ'' یاد کرتی ہوئی ..... ارد گرد ہنستے ہوئے لوگوں سے بے نیاز اپنی دھن میں مگن ، اور یہ منظر انہوں نے چند سال پہلے دیکھا تھا جب چھوٹے چچا کی شادی میں سب جمع ہوئے تھے ۔اب وہ کیسی ہو گی ؟ ۔'' پتہ نہیں مجھے کیا..... میں نے تو علی گڑھ جانا ہے'' انہوں نے اپنی سوچوں کو جھٹکا .....

جس دن گھر کے بزرگ لاہور سے واپس آئے اگلے دن عبدالرحیم علی گڑھ روانہ ہو گیا.....

علی گڑھ میں گزرے چار سال عبدالرحیم کی زندگی کے یادگار سال رہے ۔ اقامت گاہ کے ساتھی ، کالج کے استاد ، مہذب سی شرارتیں ، دل لگیاں ، پڑھائی اور غیر نصابی سرگرمیوں کا غلغلہ..... علی گڑھ میں مقیم پھوپھی رابعہ سے ملاقات مہینے میں ایک بار ضرور ہوتی کہ ہوسٹل سے باہر جانے کی کھلی اجازت نہ تھی ۔

اسی ایک ملاقات میں رابعہ پھوپھی نے عبدالرحیم کو بتایا کہ'' وہ لاہور جا رہی ہیں کوئی پیغام دینا ہو تو.....'' عبدالرحیم کا چہرہ شرم کے مارے سرخ ہو گیا ۔اس دن باقاعدہ ان کو شیریں کے نام سے انسیت محسوس ہوئی اور کچھ نیا نیا سا اپنے دل میں محسوس ہونے لگا ۔مگر کوئی'' پیغام'' دینے سے قاصر

رہے۔

پھوپھی جان لاہور سے واپس آئیں تو عبدالرحیم کو بلوایا اور بڑی رازداری سے ان کو ایک پیغام دینے کے لئے علیحدہ کمرے میں لے گئیں۔

عبدالرحیم کے دل میں شیریں کے نام سے اب مٹھاس سی اترنے لگی تھی۔

''عبدالرحیم! میں یہ تمہارے لئے باقاعدہ چُرا کر لائی ہوں۔'' ایک دستی رومال انہوں نے ٹرنک سے نکالا..... آسمانی رنگ کا وہ دستی رومال جس پہ شیریں نے اپنے ہاتھوں سے عبدالرحیم لکھ کر اُس پہ کشیدہ کاری کی ہوئی تھی۔ دوسرے کونے میں شیریں لکھا تھا دونوں ایک ہی رنگ سے کاڑھے ہوئے تھے.....''شیریں تو بے چاری یہ رومال تلاش کرتی رہے گی جب تک وہ تمہارے پاس نہ دیکھ لے گی .....'' پھوپھی نے ہنستے ہوئے کہا اور رومال عبدالرحیم کی جیب میں رکھ دیا۔ یہ وہ واحد رومانوی رابطہ تھا جو دونوں کے درمیان پہلی اور آخری مرتبہ ہوا.....شادی سے پہلے اور منگنی کے بعد۔

ان کا دل چاہا کہ پھوپھی سے پوچھیں'' وہ کّس کے دو چوٹیاں کئے ہوئے اُسی طرح ''گزرا زمانہ'' یاد کرتی ہے؟ مگر چپ رہنے کے سوا کچھ نہ کر سکے..... پھوپھی نے خود ہی بتایا کہ'' وہ بہت پیاری ہوگئی ہے۔ سلیقہ منداور سگھڑ.....علم و ادب سے دوستی کرنے والی۔ اُس کی دادی نے اُس پہ خاص توجہ دی ہے، تعلیم وتربیت کے لئے۔''

وہ مسکراتے رہے اور شیریں کا تصور بنتا، ٹوٹتا رہا۔ کیسی ہوگی ؟ ''پیاری ہوگئی ہے'' پھوپھی جان کے الفاظ سے ''پیاری'' کا کوئی تصور نہ بن رہا تھا۔ جیب میں، دل کے پاس رکھا دستی رومال ''شیریں'' کے بارے میں سوچنے پہ اکسا رہا تھا اور پھر رومال ان کے لڑکپن اور نوجوانی کا ساتھی بن گیا۔ اُس خاموش، بے زبان، بے جان کپڑے میں کائنات سماتی چلی گئی۔ آسمان کی بے کراں وسعتوں پہ وہ آسمانی رنگ کا چھوٹا سا رومال چھا جاتا۔

معصوم، بے ضرر سا رومانوی احساس علی گڑھ کالج کے شب روز میں ساتھ ساتھ رہا۔ دہلی واپس آئے تو تقسیم ہند کا مرحلہ آخری مراحل میں تھا..... حالات کی نزاکت کو دیکھتے ہوئے سب نے شادی کا فریضہ انجام دینے میں اور بھی جلدی کی۔

پورا خاندان بارات لے کر لاہور روانہ اور کوئی ایک آدھ دن کے لئے نہیں پورے ایک مہینے کا پروگرام تھا..... جب خاندانوں کی آؤ بھگت کرنا کوئی مسئلہ نہ تھا۔ بارات پورے شہر کی مہمان ہوتی۔ مہمان بھی میزبان پہ بوجھ نہ بنتے .....اشیائے خوردونوش، برتن، بستر اور کام کاج میں تعاون کرتے، سب مل جل کر خوشیوں میں پوری خوش دلی سے شریک ہوتے تھے۔

جب عبدالرحیم نے آسمانی رومال کے اوپر منہ دکھائی میں دیا جانے والا کنگن رکھ کر دلہن کو پیش کیا.....تو اُس کے چہرے کے تاثرات کا انہوں نے خوب لطف اٹھایا۔ دونوں کی آنکھوں میں بیک وقت بہت سے ان کہے جذبے روشنی دینے لگے۔

اور پھر خیالات، افکار، خواہشیں، فرمائشیں، پرسکون ندی کے صاف شفاف پانی میں تیرتی رنگ برنگی ننھی منی مچھلیوں کی طرں زندگی میں رونق لے آئیں۔جن کے رنگوں کی خوبصورتی اور پانی میں تیرتے عمل کودونوں نے اپنے اپنے انداز میں دیکھا اور شریکِ حیات کو ہر احساس میں شریک رکھا۔

نو بیاہتا جوڑے کے پاس کتنی باتیں، کتنے احساسات، کتنے کام ہوتے ہیں ایک دوسرے کے ساتھ بانٹنے کو، کئی سال تو جذبوں کے اظہار میں ہی گزر جاتے ہیں۔

عبدالرحیم مرزا نے سوچا، اب کیا دور آ گیا ہے، پہلے لڑکا لڑکی ایک دوسرے کو سمجھنے کی ضد کرتے ہیں۔ وہ ایک دوسرے کو اتنا زیادہ سمجھ لیتے ہیں کہ جب باہم مل بیٹھنے کا، صحبتِ یار سے فیض اٹھانے کا وقت آتا ہے تو سوائے گلے شکوؤں کے کچھ ہاتھ نہیں آتا۔ جب زندگی کی حقیقتوں سے واسطہ پڑتا ہے تو اپنے انتخاب پہ پچھتاوا یاد آتا ہے۔

عبدالرحیم مرزا نے ایک ٹھنڈی سانس بھری، اپنے خاندان کے دو چار واقعات یاد آئے آج کے بچوں نے جدید تہذیب کی سان پر چڑھا کر اپنے رشتے توڑ ڈالے ہیں دلوں کے نازک احساسات و جذبات کو بے وقت آشکار کرنا باہمی رفاقت کے حُسن کو برباد کر دینا ہے۔انہوں نے سوچا۔

''کیا ٹھنڈی میٹھی رفاقت تھی میری شیریں کے ساتھ''

انہوں نے دل میں اسی دورِ رفاقت کی ٹھنڈک محسوس کی۔ مشترکہ خاندان میں رہنے والے میاں بیوی کو تنہائی کا انتظار ہی رہتا..... اور اس انتظار میں کتنی لذت تھی۔ وصالِ یار کا انتظار ان کو مخمور سا رکھتا۔شرمائی شرمائی سی شیریں کام کاج کرتی ادھر اُدھر پھرتی رہتی۔آتے جاتے، اُس کے دامن کی ہوا، چوڑیوں کی کھنک ہی سے دل میں خوشی کا احساس خوشبو کی طرح بس جاتا۔ نگاہیں چار کرنے کے لئے ادھر اُدھر کا جائزہ لے لیا جاتا..... اور موقع دیکھ کر آنکھوں ہی آنکھوں میں سارے جذبے منتقل ہو جاتے ۔ اور ایک جاں فزا مسکراہٹ کے تبادلے سے دلوں میں بہار آ جاتی۔

مرد اور عورت کے لطیف تعلق میں کچھ خوف، کچھ جھجک ، کچھ نامکمل سا احساس جذبوں کو مرنے نہیں دیتا۔ وہ دور جب ساری خواہشاتِ نفس کا مرکز ایک دوسرے کی ذات ہوتی تھی۔اور اس ذات کے آشکار ہونے میں زمانے بیت جاتے تھے۔مرد اور عورت، جب میاں بیوی بن جاتے ہیں اور ایک دوسرے کی رفاقت کو معمول کی طرح گزارنے لگیں تو تعلقات میں بھی کوئی نیا پن نہیں رہتا..... کچھ دوری، کچھ نارسائی کا احساس وخلش ایک دوسرے کو حاصل کرنے کی لگن تازہ رکھتا ہے۔شوہر جب بیوی کو پورا جان لیتا ہے تو وہ کسی نئی مہم کو سر کرنے نکل جاتا ہے۔آج کے میاں بیوی ان باتوں کو کہاں سمجھنے والے ہیں۔سب کے سامنے اظہارِ عشق فرماتے ہوئے.....اور اس کو زندگی کا لطف جاننے والے کیا جانیں کہ شرم وحیا اور حجاب کی اوٹ سے جھانکتی، مسکراتی اور موقع تلاش کرتی محبت میں کس قدر لذت ہوتی ہے ..... چونکہ اب لوگوں نے طبعی خواہشوں، منفی جذبات کو چورا ہے پہ لا کھڑا کیا ہے تو وہ'' لک چھپ جانا'' اور منکشف ہو جانے کے، ان جانے خوف میں لپٹی ہوئی منتظر، پاکیزہ محبت کی جگہ

ناجائز تعلقات نے لے لی ہے۔محبت کا نظریہ بدل گیا ہے، محبت اور دوستی کا دائرہ مخلوط ہوگیا ہے۔شیطان اپنی کارکردگی پہ نازاں ہے کہ میاں بیوی کی باہمی محبت کو طاقِ نسیاں پہ رکھ دیا ہے۔ وفا اور حیا کی چادر کے سارے موتی تارے اس نے نوچ کر پھینک دیئے ہیں۔مرزا عبدالرحیم سوچوں میں گم تھے، خیالات کی رَو پانی کی طرح بہے جارہی تھی۔ دروازہ کھٹکنے کی آواز پر چونکے، پوتا ذیشان اندر آنے سے گریز کرتے ہوئے دروازے سے ہی پکارا.....

''دادا جان! ناشتہ تیار ہے، آپ کے لئے یہیں لے آؤں یا آپ اندر آئیے گا؟''

ابھی وہ جواب بھی نہ دینے پائے تھے کہ بیٹا لپک کر آیا اور اپنے والد کو سہارا دے کر ناشتے کی میز پر لے جانے لگا۔

باپ، بیٹا وسیع نشست گاہ میں داخل ہوئے جس کے ایک کونے میں کھانے کی میز تھی اس کے ساتھ ہی باورچی خانے کا دروازہ کھلتا تھا۔نشست گاہ میں صوفے۔کشن مناسب رنگوں کی تعدیل کے ساتھ بہت اچھا تاثر دے رہے تھے۔

مرزا عبدالرحیم کے اندر آنے پر کوئی لپک کر دادا کو سلام کرنے نہ آیا.....آہستہ آہستہ چلتے ہوئے دونوں میز کے ساتھ رکھی کرسیوں پر بیٹھ گئے۔مرزا عبدالرحیم نے صوفے پہ نگاہ ڈالی۔سب سے بڑا پوتا جس کی حال ہی میں منہ زور عشق کے نتیجے کی شادی ہوئی تھی اپنی بیگم کے ساتھ بیٹھا تھا ایک تو اندازِ نشست ایسا، اوپر سے بیگم ہنوز لباسِ شب خوابی میں ..... مارے شرم و غیرت کے انہوں نے جلدی سے چہرہ دوسری طرف کرلیا، دل میں ناگواری کا احساس لئے جب دوسری طرف نگاہ ڈالی تو نوعمر پوتا اپنی ہم عمر ماموں زاد بہن کے ساتھ ریموٹ کنٹرول کے لئے چھینا جھپٹی میں مصروف تھا۔ دونوں اس طرح ایک دوسرے پر جھپٹ رہے تھے جیسے چند سال کے بچے ہوں۔ حالانکہ اس عمر میں تو.....شیریں نے بیٹیوں کو پردہ شروع کرادیا تھا۔اف!! میں اس گھر کا ''ماضی'' ہوں۔ یہ نو بیاہتا جوڑ سب کے درمیان بیٹھ کر اٹھکیلیاں کرتا ہوا اس گھر کا ''حال'' ہے.....اور یہ بچے اس گھر کا ''مستقبل'' ہیں.....مرزا نے تشویش بھری ایک ٹھنڈی سانس بھری.....اُف!..... یہ بے باکی اور لباس کی بے حجابی ؟ دل پہ اک بوجھ سا آن ٹکا..... دل کا بوجھ خیالوں میں شیریں سے کہہ ڈالا۔

''شیریں! اگر تم یہ سب دیکھتیں تو کیا کرتیں؟ میں نے تو اظہار کرنا ہی چھوڑ دیا ہے'' اچھا ہوا تم ترقی معکوس کے مناظر دیکھنے سے پہلے رخصت ہوگئیں ورنہ حیا کا لبادہ اُترے دیکھ کر تمہارے دل پہ کیا گزرتی.....''

اللہ تعالیٰ نے انسان کے لئے لباس اتارا.....شیطان نے وہ لباس اتروایا.....اب انسان جتنا شیطان کے قریب ہوتا جاتا ہے لباس سے بے نیاز ہوتا چلا جاتا ہے۔عورت لباس سے بے نیاز، حیا سے عاری ہو جاتی ہے۔ مرد بے غیرت ہوتا جاتا ہے ..... انسان اور جانور میں لباس اور غیرت کا ہی فرق ہوتا ہے۔سر جھکائے مرزا عبدالرحیم ایسے مسافر لگ رہے تھے جو ایک لمبا سفر طے کرنے کے بعد بھی

اپنی منزل سے دور ہوتا جا رہا ہو.....

ناشتے کی میز پر سب نے غل مچائے رکھا.....نوعمر بچے ۔جوان جوڑے ادھیڑ عمر بیٹا، بہو اور بوڑھے مرزا عبدالرحیم ماضی، حال، مستقبل جمع تھے کسی کو احساس نہ تھا کہ کسی بزرگ کی موجودگی میں کیا کہنا ہے کیا نہیں؟ لے دے کے بیٹا اور بہو شش شش کر کے خاموش رہنے کا اشارہ کرنے لگتے.....'' ماضی اور مستقبل کے درمیان کی یہ کڑی کمزور پڑنے سے تہذیب میں فاصلے بڑھ گئے ہیں۔'' مرزا نے اپنے بیٹے اور بہو کو صرف خاموشی کے اشارے کرتے دیکھ کر سوچا..... ناشتے کے بعد بوجھل دل، تشویش و فکرمند ذہن لئے مرزا اپنے کمرے میں آئے.....شیریں کی یادوں نے پھر ان کو آن گھیرا..... بے اختیار وہ گنگنانے لگے۔

آج وہ دل ہے قفس اندر، قفس اندر قفس
جو کبھی گلزار، در گلزار، در گلزار تھا
او، روانہ ہونے والے دیکھ پیچھے رہ گیا
تجھ سے پہلے جس کا سامانِ سفر تیار تھا
رہ گیا طوفانِ غم میں ڈبکیاں کھاتا ہوا
کاش میں بھی ڈوب ہی جاتا تو بیڑہ پار تھا
(جام نوائی)

انہوں نے اپنے ان دنوں کو سوچا جب ان کی شادی ہوئی تھی اور آج کے ان جوانوں کے انداز.....کیا ہم افراط و تفریط کا شکار ہیں؟ انہوں نے کبھی شیریں کا ہاتھ تک نہ پکڑا سب کے درمیان، ایک چارپائی پر اکٹھے نہ بیٹھے.....کیا وہ غلط تھا..... یا پھر یہ غلط ہے..... یا دونوں ہی غلط ہیں! شاید ہمارے درمیان اعتدال نہیں ہے ہم ایک حد سے واپس آتے ہوئے صحیح جگہ نہیں رکتے بلکہ دوسری حد کے قریب چلے جاتے ہیں انہوں نے خود کلامی کی ''بہرحال یہ جو کچھ آج ہو رہا ہے یہ اُس سے زیادہ غلط ہے جو ہمارے دور میں ہوتا تھا۔''

حیا ہر کام اور ہر چیز میں خیر ہی لاتی ہے۔ بے حیائی ہر کام ہر چیز اور ہر بات میں برائی ہی لاتی ہے.....

انہیں یاد آیا کہ خود سپردگی کے خاص لمحات میں بھی حیا کے احساس سے غافل نہ ہوئے اور شیریں سے ان کو کبھی شکوہ نہ ہوا.....تہذیب و شائستگی ہر لمحہ مومن کا شیوہ ہوتی ہے ۔طبعی خواہشیں زندگی کا ایک جزو ہیں نہ کہ زندگی کا مقصد۔ انہیں یاد آیا کہ ان کی شادی سے کچھ دن پہلے نصیحت کی تھی پڑوسی چچا حامد نے جو عمر میں ان کے برابر تو نہیں تھے لیکن دوستی کا رشتہ ضرور تھا۔

''عبدالرحیم! جو شوہر بیوی کو ہر وقت نفسانی خواہش کی عینک لگا کر دیکھتے ہیں۔ وہ بیوی کی دیگر قابلیتوں سے منکر ہو جاتے ہیں اور بیوی اس بات کو پسند نہیں کرتی کہ شوہر اُسے ہر وقت صرف ایک خواہش ہی کی عینک لگا کر دیکھے۔ بیوی کی صلاحیتوں، قابلیتوں کو تسلیم کرو گے۔ اعتراف کرو گے۔ قدر کرو گے تو فاتح کہلاؤ گے.....مردانگی کا مطلب اعلیٰ ظرفی ہے۔''

خیالوں میں چچا حامد کی نصیحت دہرا کر انہوں نے اثبات میں سر ہلایا۔

واقعی بیوی کے نازک جذبات صاف شفاف ندی کے اندر تیرتی رنگ برنگی ننھی منی مچھلیوں کی مانند رہتے ہیں تو ان

میں مرد کو کشش محسوس ہوتی رہتی ہے۔ وہ جذبات جو حیا کے صاف شفاف پانی میں رہیں نظر تو آئیں، ہاتھ نہ آئیں۔ مرد کی فطرت ایسی ہے کہ جب مطلوب شے مکمل طور پر ہاتھ آجاتی ہے تو اس میں کشش نہیں رہتی۔

شیریں کو یہ پتے کی بات کس نے سکھائی ہو گی ؟.....شاید حیا ایسے گُر خود ہی سکھا دیتی ہے۔

ساتھ ہی ان کو صبح کا منظر پھر یاد آ گیا..... جب سب کچھ ہر وقت عیاں ہو، دسترس میں ہو تو..... نہ قدر رہتی ہے نہ کشش۔

خلوت و جلوت میں ایک نقطے کا فرق ہے۔ لیکن اس نقطہ کو اپنے مقام پر رکھنے سے دونوں کے معنی واضع ہوتے ہیں۔ انسانی جذبات ہوں یا لفظوں کے نقطے، اپنے مقام سے ہٹ جائیں تو معنی بدل جاتے ہیں۔ مسلم معاشرے میں خلوت و جلوت کے آداب متعین کر دیئے گئے ہیں۔

مرزا عبد الرحیم نے پانی کی بوتل کا ڈھکن کھولتے ہوئے زیر لب کہا

جب تھا ہر گھر میں حجاب اور تکلف کا رواج

اب وہ ماضی کی روایات ہیں بدلی بدلی

اب تو بے باک اداؤں کا زمانہ ٹھہرا

لڑکیاں اب ہیں کہاں لاج سے سمٹی سمٹی

چچا حامد کی نصیحت کو انہوں نے نہایت سنجیدگی سے سنا تھا۔ اور عمل میں لانے کی پوری کوشش کی تھی۔ بیوی کے ہر کام کو.....عمر کے ہر دور کو..... ذمہ داریوں کی ادائیگی کے ہر عمل کو.....محبت کی نظر سے دیکھا۔ ہر روز .....ایک نیا منظر دیکھا۔ فرض کی ادائیگی میں محبت کا رچاؤ محسوس کیا، ہر رنگ کے لباس میں نئی نظر آتی ..... ہر نئے لباس میں طرح داری بڑھ جاتی۔ ہر نئے بچے کی آمد پر چہرے پر مامتا کا نور ان کو حیران کر دیتا۔ ہر رشتہ نبھاتے وہ اک نرالا جزیرہ لگتی۔ جو ابھی ابھی دریافت ہوا ہو..... کتنے روپ تھے اس کے، ہر روپ پہلے سے مختلف ہوتا سارے عرصہ حیات میں حیا کا مخصوص احساس شیریں کے انداز و اطوار میں رچا بسا رہا۔ جس سے چہرے کی تمکنت میں اضافہ ہی ہوتا گیا۔

کفن میں لپٹی شیریں کو دیکھ کر مرزا عبد الرحیم چونک چونک گئے۔ انہوں نے اس کو سفید کپڑوں میں کبھی نہ دیکھا تھا۔ رنگین کپڑے پہننے والی آج سفید رنگ کے لباس میں اک نرالا روپ دکھا رہی تھی۔ کیا واقعی تم اتنی خوب صورت تھیں شیریں !زخمی زخمی دل کے ساتھ چند آنسو کفن میں جذب ہو گئے۔ محبت کا اک نرالا سا احساس اس چہرے سے وابستہ ہو گیا۔ وہی شعر ان کے ہونٹوں پہ مچلنے لگا جو ہر نئے لباس پر بیوی کو سنایا کرتے تھے۔

جب بھی دیکھا ہے تجھے، عالمِ نو دیکھا ہے

مرحلہ طے نہ ہوا، تیری شناسائی کا

شناسائی سے ان کو یاد آیا کہ اب تو میاں، بیوی کا رشتہ بننے سے پہلے ہی شناسائیوں کے سارے مرحلے مکمل ہو جاتے ہیں۔ پھر کچھ نیا نہیں رہتا۔ شناسائی قطرہ، قطرہ توانائی

بن کر ساری عمر رگوں میں اترتی رہے تو جذب و کیف کم نہیں ہوتا..... بھڑکتا شعلہ نہ ہو بلکہ دھیمی دھیمی حرارت زندگی بخشتی رہے۔

دوپہر سے شام ہوگئی۔ معمول کا آنا جانا۔ کھانا پینا چلتا رہا..... مگر مرزا نے ''نہار منہ'' جو مناظر آج دیکھے تھے اُس کا ''کڑوا ذائقہ'' ابھی تک محسوس ہو رہا تھا۔ غیر ارادی طور پر وہ نہ جانے کتنے گلاس پانی حلق سے نیچے اتار چکے تھے ..... حسب معمول سونے سے پہلے جاوید مرزا اپنی بیگم کے ساتھ اپنے والد سے ملنے آئے۔ جاوید نے صبح ہی اندازہ لگا لیا تھا کہ آج ابا جان زیادہ بات چیت کرنے کے موڈ میں نہیں ہیں۔ مگر اس وقت وہ زیادہ ہی پژمردہ اور اداس لگ رہے تھے۔

''ابا جان! کیسی طبیعت ہے آپ کی؟'' بہو نے قریب ہو کر پوچھا۔ مرزا عبدالرحیم کو محسوس ہوا کہ یہ بس ایک معمول کا سوال ہے روزانہ تو یہ سوال ان کو محبت کا احساس لگتا۔ مگر آج ان کے چہرے پر کوئی نرم تاثر نہ ابھرا..... دل کی خلش کسی طرح باہر آنے کا بہانہ تلاش کر رہی تھی۔ جاوید اور شائستہ فرمانبردار بہو بیٹے تھے۔ خاندانی روایات کا جو تھوڑا بہت پاس تھا وہ ان میں ہی نظر آتا تھا.....

مرزا عبدالرحیم نے ہاتھ کے اشارے سے دونوں کو بیٹھنے کے لئے کہا۔

''جاوید! تمہاری ماں کو میری آنکھوں سے اوجھل ہوئے آٹھ سال چھ مہینے دس دن اور چند گھنٹے ہو گئے ہیں ..... جب قبر میں لیٹی تمہاری ماں کا آخری دیدار کر کے میں نے سِل قبر پر رکھی تو گھڑی دیکھ کر میں نے گھڑیاں گننا شروع کر دی تھیں۔ جاوید اپنے باپ کی شکستہ حالت دیکھ کر آبدیدہ ہو گیا۔ ''بیٹا! ماؤں کی ضرورت ہر وقت رہتی ہے۔ جو بچوں کو اور ان کے بچوں کو بُرے بھلے کی تمیز سکھاتی رہیں..... اُس نے یہ فریضہ بخوبی انجام دیا مگر میں یہ کام نہیں کر سکا ..... تمہاری ماں نے مجھ سے وعدہ لیا تھا کہ اُس کے بعد اولاد کی راہوں کے چراغ بجھنے نہ دوں .....مگر آج میرا دل بہت آزردہ ہے۔ شرمندہ ہے۔''

بہو نے ان کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر محبت سے پوچھا

''ابا جان! آج کیا ہوا؟ کیا ہم سے کوئی غلطی ہو گئی؟''

''بیٹا! ہم نے اپنی اولاد کی تربیت جن خطوط پر کی ..... وہ مٹتے نظر آ رہے ہیں۔ بے شک ہر دور کے کچھ نئے تقاضے ہوتے ہیں ان کا بھی خیال رکھنا چاہیے اور یہ بھی حقیقت ہے کہ ہر نسل کچھ نہ کچھ غلطیاں کرتی ہے۔ نئی نسل کو جاننا چاہیے کہ ''خطائے بزرگاں گرفتن خطاست''

شائستہ نے تعجب سے سوچا، تو کیا اس کا یہ مطلب ہے؟ ہمیں تو یہی سمجھایا جاتا ہے کہ بزرگ غلطی کریں تو چھوٹے اس کی نشاندہی کرنے کی گستاخی نہ کریں۔ اس نئی دریافت پر وہ بے اختیار مسکرانے لگی۔ پھر فوراً ہی اس کو ابا جان کی کیفیت کا احساس ہونے لگا۔ واقعی ہم نے افراط و تفریط کے دونوں ادوار کا صحیح ادراک نہ کیا، کم از کم خوبیوں کو ہی قائم رکھ لیتے! ابا جان کی فکرمندی بجا ہے۔ ویسے بھی ناشتے پر..... والد کے چہرے کے تاثرات سے وہ اندازہ لگا چکے تھے کہ کمرے کے مناظر سے وہ رنجیدہ ہیں..... دونوں کے پاس کہنے کو کچھ نہ تھا

۔اگر کچھ تھا بھی تو وہ بے سود تھا..... وہ خود بھی بچوں کے انداز واطوار سے خوش نہ تھے۔

''ابا جان ! آپ درست فرماتے ہیں ۔ یقیناً یہ ہماری کوتاہی اور غفلت ہے۔''

''بیٹا! غفلت ہی تو ہر فتنے کی کنجی ہے۔''

''جی'' جاوید مرزا نے تائیدی لہجے میں کہا

''ابا جان ! غفلت تو ہو ہی جاتی ہے، انسان غفلت کو کیسے پہچانے؟'' شائستہ نے نرم سے لہجہ میں سوال کیا۔

''طبعی خواہشات کی طرف رجحان حد سے گزر جائے تو دل میں غفلت کا دھواں بھر جاتا ہے ۔ اللہ تعالیٰ کی یاد سے، ترجیحاتِ زندگی اور احساسِ عبودیت سے دل خالی ہو جاتا ہے ۔''

مرزا عبدالرحیم نے باری باری دونوں کو دیکھا، دونوں سر جھکائے بیٹھے تھے.....

''گزرتے ماہ وسال میں یہی ایک چیز تو معاشرے میں پنپ رہی ہے ۔ ترجیحات بدل رہی ہیں۔'' شائستہ نے سر جھکائے دھیمے لہجہ میں کہا،

''ابا جان! ہر نفس آزاد ہونا چاہتا ہے۔ اپنی مرضی سے جینا چاہتا ہے۔''

مرزا عبدالرحیم نے جاوید کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے کہا

بیٹا! کیا آزادی کا مطلب یہ ہے کہ دین، اخلاق اور تہذیب سے بھی آزاد ہو جایا جائے؟

پھر مہذب معاشرہ اور جانوروں میں کیا فرق رہ جاتا ہے؟

جاوید شرمندہ سے ہو کر بولے ''ابا جان! میرا یہ مطلب ہرگز نہیں تھا۔ میں یہ پوچھنا چاہ رہا تھا کہ ہم معاشرے کی گرتی ہوئی قدروں کو پھر سے زندہ کیسے کریں؟''

بیٹا جاوید! شائستہ بیٹی! انہوں نے شفقت بھرے لہجہ میں دونوں کو مخاطب کیا۔

''جب پاکستان بننے کا اعلان ہوا تو ہمارا خاندان بارات کی صورت میں لاہور موجود تھا کسی نے اس نوزائیدہ وطن سے واپس جانے کی حامی نہ بھری..... میری شادی کو سب نے بڑی بابرکت شادی قرار دیا۔''

بہو نے حیرت اور استفہامیہ نظروں سے شوہر کو دیکھا ..... بھلا کیا یہ موقع ہے پرانی بات کرنے کا ..... ہلکی سی ناگواری کا سایہ بھی چہرے سے ظاہر ہوا، اس کو فکر تھی کہ اب سارے قصے کہانیاں سننے کے لئے دیر تک بیٹھنا پڑے گا۔

شوہر نے نظروں ہی نظروں میں بیوی کو تسلی دیتے ہوئے باپ کی طرف رُخ کیا۔

''جی ہاں! ابا جان!''

''سب نے اس بات پر بھی شکر ادا کیا کہ خون خرابے اور عزتوں کے لٹنے کے دکھ سے محفوظ و مامون رہے.....اور یہ شادی اسلامی ریاست میں قرار پائی۔''

عبدالرحیم مرزا یہ کہہ کر خاموش ہو گئے .....دونوں منتظر رہے کہ اب کچھ کہیں۔ شائستہ نے پہلو بدلا.....

''ہاں! اُس وقت کسی کو پیچھے رہ جانے والے اثاثوں، سامان، کاروبار، کا دکھ نہ محسوس ہوا..... بڑے سُکھ، خوشی اور

نعمت کے حصول پر کم اہمیت کی چیزیں ایسے ہی آسانی سے قربان کی جاسکتی ہیں .....کیا کھوکر کیا پایا؟ ہم نے ایک آزاد اسلامی ریاست حاصل کی۔اپنی نسلوں کو مثالی مسلمان بنانے کے لئے ''مدینہ ثانی'' حاصل کیا۔سب کچھ دے کر۔کیا اس بڑی نعمت کی کوئی قیمت ہوسکتی ہے۔؟ انہوں نے جاوید کی آنکھوں میں جھانکا۔

''نہیں ابا جان''

کسی نعمت کا حصول جس قیمت پہ ہوتا.....اس کی حفاظت اور بقا بھی اتنی ہی قیمت مانگتی ہے۔ بلکہ شاید اس سے بھی زیادہ۔

''غفلت سے ایک معمولی چیز بھی ہاتھ سے جاتی رہتی ہے۔آزادی، اور ملک وقوم کی بقا میں غفلت کرنا کتنا بڑا نقصان ہے؟ اپنی اولادوں کو آگ کا ایندھن بننے سے بچانا کتنا ضروری ہے.....کیا ہم غفلت کے متحمل ہوسکتے ہیں؟''

شائستہ نے چونک کر ان کو دیکھا..... بے اختیار اُسے ڈھاکہ میں گزرے ہوئے دن یاد آگئے .....اُس نے ایک جھرجھری سی لی.....اور دل میں درد کا احساس جاگا۔

''غفلت کا ہی تو نتیجہ بھگتا قوم نے .....'' ایک سرد آہ بھر کر اُس نے سوچا۔

بیٹا! ہم نے اللہ تعالیٰ سے جو وعدے کئے ان کو پورا کرنے کے لئے آپ کی باری ہے ہم تو چراغ سحری ہیں۔ قوم کا ہر فرد..... ہماری اولادوں کا ہر بچہ اس وعدے کو پورا کرنے کا ذمہ دار ہے۔فطرت انفرادی گناہوں کو معاف کر دیتی ہے مگر قوموں کی لغزش،غفلت،معاف نہیں کرتی۔قوم کا ہر فرد ملت کے مقدر کا ستارہ ہے تو پھر ہم ان ستاروں کی روشنی کو ماند کیوں ہونے دیں؟ ہر تہذیب کی کوئی بنیاد ہوتی ہے .....اسلامی تہذیب کی بنیاد،''حیا'' ہے اور یہ ملک اسلام کے نام پر بنایا گیا تھا نا!

''جی'' دونوں میاں بیوی نے بیک وقت کہا۔

مرزا عبدالرحیم اکثر و بیشتر اس موضوع پر بات کہتے رہتے تھے۔ان کو محسوس ہوا کہ شاید نصیحت قبول کرنے کا یہ وقت ہی متعین تھا.....انہوں نے دونوں کو محبت سے دیکھا۔ جو پوری آمادگی کے ساتھ ہمہ تن گوش تھے۔

''غفلت دل کے شیشے کی گرد ہوتی ہے۔گرد بڑھتی رہے تو شیشہ اندھا ہو جاتا ہے۔'' بہت دیر تک تینوں کے درمیان محبت،شفقت اور احترام وعقیدت کی فضا قائم رہی دونوں کے دل کا آئینہ جو مدتوں سے گدلا ہو رہا تھا آج اُس کے اُجلا ہونے کا سامان نظر آنے لگا تھا۔

☆☆☆

فرزانہ چیمہ

چلتے چلتے

قارئین و شائقین چلتے چلتے کو ہمارا سلام پہنچے ۔ آپ حیران ہو رہے ہوں گے کہ '' چلتے چلتے'' آخر کہاں رک گیا؟ اور کیوں رک گیا؟ خیر......!اس کہاں اور کیوں کو تو چھوڑ یئے کے جب اس طرح کی تحقیق و تفتیش میں پڑ جائیں تو پھر کچھ پردہ نشینوں کے نام بھی آ جاتے ہیں۔ یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ ہم کچھ ستانے کے شوق میں مبتلا ہو گئے ہوں مگر ہمیں یہ خیال ہی نہ رہا کے '' چلتے چلتے'' کو ماہنامہ ''بتول'' میں چل رہا ہے جس کی داغ بیل ایسی مبارک خواتین نے ڈالی تھی کہ جن کے ہاں آرام کرنا، ستانا، اوڑھ لپیٹ کر سو رہنا...... یہ سب کچھ بے اصل اور بے معنی تھا ۔ گویا جماعت اسلامی کی بنیادوں میں کام، کام اور کام......صبح و شام کام ہی کام...... قبر میں آرام...... اول دن سے ڈال دیا گیا ہے ۔ سو ہمارا ستانا...... چپ رہنا ہمارے بہت سے مہربانوں کو پسند نہ آیا اور مختلف ذرائع سے استفسار، اصرار اور شفقت و پیار کا تقاضا کچھ اس اطوار سے ہوا کہ ہمیں چلتے رہنے کا اقرار و اظہار کرنا ہی پڑا۔

اپنی بے تکلف بہنوں اور دوستوں کو تو ہم ہنستے ہنستے ٹال بھی سکتے تھے مگر ڈاکٹر نزہت اکرام، محترمہ عامرہ احسان ، محترمہ سلمٰی یاسمین نجمی، آپا جی سعیدہ قطب کو ہم کیسے انکار کر تے اور عزیزہ زہرہ نہالہ جو مینا آپا کی رحلت کے بعد ہمیں مزید عزیز ہو گئی ہیں ان کی مدلل گفتگو...... پھر ان کے بعد آپا جی زہرہ عبدالوحید...... جن کا جماعت اسلامی میں اپنا ہی مقام کیا کم ہے اب ادارۂ بتول کی صدر بھی منتخب ہو گئی ہیں......اور آپ تو جانتے ہی ہیں کہ صدر کا مقام ہمارے ہاں وہ تو نہیں ہوتا جو ان دنوں ہمارے پاکستانی صدر زرداری صاحب کا ہے ۔ ہمارے ہاں تو اطاعت امید فرض ہے بلکہ اُدھر اطاعتِ زر لازم ہے ۔کوٹھی میں دانے ہیں تو پھر کملے بھی سیانے ٹھہرتے ہیں۔ معاف کیجئے گا چند جملہ ہائے مقرضہ درمیان میں آ گئے ۔ ہاں تو ہم بات کر رہے تھے صدر ادارۂ بتول کی ......اب ان کا کہا کون ٹالے ۔؟ ان کا کہنا تو محترم منور صاحب نہیں ٹالتے نہ قاضی صاحب نے ٹالا ہوگا۔ پھر ہماری یہ مجال کہا......؟ سو'' چلتے چلتے'' کے سفر پر پھر چل نکلے ہیں......چل میرے خامے! بسم اللہ۔

<u>''بال ٹھاکرے کی پوتی نے اسلام قبول کر کے مسلمان سے شادی کر لی ۔ نیہا اور محمد نبی فزیوتھراسیٹ میں ڈیڑھ برس قبل کلینک میں ملاقات ہوئی ۔ ٹھاکرے خاندان کی شادی میں بھرپور شرکت''</u>

جی ہاں! یہ وہی بال ٹھاکرے ہیں جو ہندوستان بھر کے مسلمانوں کے لئے وبالِ جان بنے ہوئے ہیں ۔ ہندو انتہا پسند تنظیم شیو سینا کے سربراہ بال ٹھاکرے نے مسلمان

آبادی کو ٹھوکر پہ رکھا ہوا ہے ۔کوئی دن نہیں جاتا کہ یہ مسلمانوں پر ظلم وستم نہ کرے۔ گویا مسلمان دشمنی میں یہ ایک علامت بن کر رہ گیا ہے ۔سبحان اللہ ! قدرت نے بھی کیسا انتقام لیا ہے اس دشمنِ اسلام سے کہ خرو داسی کے بیٹے کی بیٹی نے اسلام قبول کر لیا ۔ یہ خبر سنتے ہی اس پہ کیا بیتی ہوگئی ۔ اندازہ کیا جاسکتا ہے ۔کہاں تو اتنی دشمنی اس دین کے پیرو کاروں سے اور کہاں اب شادی میں بھی بھرپور شرکت ۔ یہ بھی ہندو بنئے کی کوئی چال ہی نہ ہو۔ بہرحال فی الحال تو اس خیر پر یہی کہا جاسکتا ہے

؎اس گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے

☆.....☆.....☆

''امریکہ اتحادی نہیں ، غلام چاہتا ہے ، دنیا واشنگٹن کے احکامات سن سن کر تھک گئی ، روسی وزیراعظم لیوٹن''

چاہیے تو تھا کہ یہ بیان پاکستانی حکومت دیتی جس کے گوڈے گٹّوں میں امریکہ کچھ اس طرح سے بیٹھا ہے کہ اب نکلنے کا نام نہیں لے رہا۔نیٹو سپلائی بند کی ہے تو اس کی جان پہ بن آئی ہے ۔مگر یہ بھی نہ جانے کب تک بند رکھنے کا حوصلہ رکھتے ہیں۔؟

اگر دس سال پہلے مشرف صاحب جرأتِ ایمانی کا مظاہرہ کرتے تو شاید آج ہماری تاریخ اتنی تاریک نہ ہوتی اور ہماری پیشانی پہ اتنے داغ نہ ہوتے ..... ہمارا لہوا تنا سستا نہ ہوتا..... ہمارا خون اتنا پتلا نہ ہوتا۔ستم بالائے ستم تو یہ ہے کہ جمہوری حکومت جسے بچہ جمہوری حکومت کہنا زیادہ مناسب ہے.....وہ بھی مشرف کے قدموں پہ قدم رکھے چار سال پورے کر گئی ہے اور امریکہ اسے جب چاہتا ہے ہانک لگاتا ہے'' بچے جمورے گھوم جا'' تو یہ فورات جس طرف وہ اشارہ کرتا ہے اُدھر گھوم جاتی ہے ۔زرداری حکومت تو امریکہ کو اتنا اپنا سمجھتی ہے.....اتنا اس پر بھروسہ کرتی ہے کہ آپ اس بھروسے کے اندر سے میموگیٹ وجود میں آ گیا ہے اور اس دھڑلے سے وجود میں آیا ہے کہ صدر صاحب کو ایوان صدر کا بیرونی گیٹ صاف نظر آنے لگ گیا ہے (اور بفضل خدا اس گیٹ سے گذر کر باہر ہونے کو ہیں ۔ اب ہوئے کہ تب ہوئے) اور یوں حکومت اور اس کے جھولی چُک یعنی ماضی کے شیرافگن اور حالیہ بابر اعوان ٹائپ لوگ ایک طرف ہیں اور میمو کو ایک حقیقت ماننے سے انکاری ہیں دوسری طرف ہماری سیانی اکثریت بمعہ کیانی اس میمو کی حقیقت کو تسلیم کرتی ہے اور اس کی صاف شفاف تحقیق کی خواہاں ہے ۔ چنانچہ ان خطوں پہ معاملہ سپریم کورٹ میں زیر سماعت ہے ۔ذرا 16 دسمبر کی یہ خبر تو دیکھئے ۔

'' سپریم کورٹ مقدمے کی سماعت نہیں کر سکتی ۔ درخواست خارج کی جائے: وفاق''

23 دسمبر کا ''ڈان کہتا ہے :''(govt,army on collisian couse)

''میمو فوج اور ملک کے خلاف سازش ہے: کیانی''

یہ کیس چونکہ عدالت عالیہ میں زیر سماعت ہے لہٰذا ہم تو کسی قسم کا تبصرہ کر نہیں سکتے ویسے اخبارات پڑھ پڑھ کر سمجھ تو ہمارے بچوں کو بھی آ رہی ہے کہ سازش کون کر رہا ہے؟ اور کس کے خلاف کر رہا ہے؟ امید تو ہے کہ یہ سطور پڑھنے تک میموگیٹ

کا اونٹ کسی نہ کسی کروٹ بیٹھ ہی جائے گا۔ اور قوم یوم تشکر منائے گی۔ انشااللہ العزیز ویسے ہمیں تو کبھی کبھی اپنے صدر پہ ترس آنے لگتا ہے، نہ جانے کون کون سا موڑ کاٹ کر ..... میلوں پینڈا کر کر کے جب ایوان صدر تشریف فرما ہو ہی گئے ہیں تو حاسدوں سے ہضم ہی نہیں ہو رہا ان کا عروج و اقبال .....اب بیماری ہی کو لے لیجئے۔ ہمارے صدر صاحب ذرا بیمار کیا ہوئے کہ میڈیا اور دوسرے لوگوں نے آسمان سر پر اٹھا لیا۔ رہی سہی کسر وزیروں، مشیروں نے پوری کر دی ایسے دانا و بینا وزیر مشیر بھلا کس کو میسر آئے ہوں گے؟ ایسے ایسے بیانات دیئے کہ صبح کچھ، رات کو کچھ۔ نہ صدر صاحب کے لئے بیمار رہنا مناسب ٹھہرا اور نہ ہی صحت مند ہونا ضامن وطن واپس آئے ہی بنی۔ جی ہاں وہ بیمار ہوتے ہی آناً فاناً دبئی منتقل ہو گئے تھے..... شاید امراض قلب کے علاج کے لئے دبئی، امریکہ، برطانیہ سے بھی زیادہ آگے ہے۔ اور دبئی میں رہائش پذیر بلاول صاحب اسی روز پاکستان آ گئے۔ چہ خوب! باپ سے محبت ہو تو ایسی ہو..... بیماری ہو تو ایسی ہو اور زرداری ہو تو ایسا ہو۔

؎ گھر ہے یہاں ہمارا، گھر ہے وہاں ہمارا
پیسہ نہیں بردار! آخر کہاں ہمارا؟
جب چاہیں آئیں، جائیں امریکہ یا امارات

''مسلم ہیں ہم، وطن ہے سارا جہاں ہمارا''

☆.....☆.....☆

''پنجاب اسمبلی: قرآن و حدیث کو نصاب کا حصہ بنانے سمیت چار قرار دادیں منظور۔ میٹرک تک طلباء و طالبات کے لئے قرآن پاک (ترجمہ و تفسیر) اور احادیث مبارکہ کو تعلیمی نصاب کا لازمی حصہ قرار دینے کی قرارداد متفقہ طور پر منظور کر لی گئی۔''

اس خبر پر دیر آید درست آید سے زیادہ کیا کہا جا سکتا ہے چلیے جب بھی ایمان بڑھ جائے۔ غنیمت ہے۔ اسلامی جمہوریہ پاکستان اور کرتوت ہمارے ایسے سفاک ..... بے باک.....ناپاک کے درس کتاب سے قرآنی آیات نکال دی گئیں اور وہ بھی دشمن کی خوشنودی کی خاطر مجھے

؎ بتا تو سہی اور

یہ ''سنہری کارنامہ'' مشرف کے عہد دلنگار میں انجام دیا گیا اور بزعم خود اللہ کا سپاہی یعنی کہ پرویز الٰہی بالکل خاموش رہا۔ شجاعت حسین میں بھی ذرا شجاعت نہ رہی کہ مشرف کو روکتے۔ زبیدہ جلال بھی قطعاً کوئی جلال نہ دکھا سکی۔ بلکہ یہ سب شمع پرویزی کے پروانے بنے رہے۔ مشرف کے دیوانے بنے رہے۔ پھر اللہ رب العالمین کو جلال آ گیا۔ چنانچہ آج نہ وہ شمع ہے اور نہ اقتدار اور نہ ہی اُس دور کے پروانوں کی وہ بہار۔

اللہ کا شکر ہے جو شہباز شریف کی پنجاب اسمبلی نہ یہ قرارداد منظور کی ہے۔ اب اسے جلد از جلد قانونی شکل میں ڈھال کر کتابوں آراستہ کر دینا چاہیے کہ قرآن و حدیث کے بغیر نہ تو ہماری پہچان ہے اور نہ ہمارے بچوں کی .....اور نہ ہماری آئندہ نسلوں کی.....ہمارا تو ایمان ہے۔

؎ تبدیلی کے تین نشان
اللہ، محمد اور قرآن

ان کی رحمت کے سائے میں
جیوے جیوے پاکستان

☆.....☆.....☆

''سماجی تبدیلی کے لئے طالبات ساتھ دیں۔ پاکستانی عورت کی آواز بنوں گی۔اکیسویں صدی عورت کی ہے۔گھر میں بند کر کے نہیں رکھا جا سکتا۔مریم نواز شریف''

لیجئے صاحب! لیڈروں کی ہمارے ہاں پہلے کیا کمی تھی جواب ایک اور لیڈر خاتون سامنے لا کھڑی کر دی گئی ہے۔ ابھی پچھلے دنوں فضہ گیلانی لیڈر بنائی گئی ہیں۔اس سے قبل فاطمہ بھٹو بھی ایک عدد کتاب لکھ کر لیڈر شپ کے خواب دیکھ رہی ہیں ادھر فریال تالپور بھی صوبہ سندھ میں خاصے کی چیز ہیں کہ صدر صاحب کی ہمشیرہ جو ٹھہریں۔

گویا ہر کوئی ہیجو ما دیگرے نسیت کا ورد کرتی، خواتین کے مسائل کے حل کے لئے مسیحا کا روپ دھارے میدانِ سیاست میں آنکلی ہیں.....مسائل تو یہ کیا حل کروائیں گی اکٹا اپنی موجودگی سے نہ جانے کتنوں کے لئے خود مسائل بنیں گی ..... رہ گئی یہ بات کہ اکیسویں صدی عورت کی ہے تو مریم نواز صاحبہ اکیسویں کیا ہر صدی..... ہر سال، ہر دن عورت کا ہے۔ارے بھئی! جس لمحہ اللہ خالق و قادرِ احد نے حضرت آدمؑ کی تنہائی کا خیال کر کے ان کی پسلی سے عورت پیدا کی تھی اسی لمحے سے عورت گھر، معاشرہ اور مرد سب کے لئے ناگزیر ہو کر رہ گئی ہے..... یقین نہ آئے تو اس گھر میں جھانک کر دیکھ لیجئے جس گھر میں عورت نہ ہو۔اس بچے کی حسرت و یاس ملاحظہ کر لیجے جس کی ماں نہ ہو، سچ کہا اقبال نے۔

؎ وجود زن سے ہے تصویر کائنات میں رنگ

مگر یہ زن اسلامی تعلیم و تربیت کے سانچہ میں ڈھلی ہو گی تو بھلے زنگ بکھیرے گی ورنہ شتر بے مہار سٹائل عورت تو تصویر کو داغ دار کر کے رکھ دے گی۔سوز مانہ بھر کی عورتوں کو ہمارا مشورہ ہے کہ

؎ ایسے ملا کرو کہ کریں لوگ آرزو
ایسا چلن چلو کہ زمانہ مثال دے

☆.....☆.....☆

''تنسیخ نکاح کے دعوؤں میں خوفناک حد تک اضافہ۔ عائلی نظام خطرے میں پڑ گیا۔مذہب و مشترکہ خاندانی نظام سے دوری، اخلاقی قدروں کا لحاظ نہ کرنا بڑی وجوہات ہیں۔''

سچ تو یہ ہے کہ یہ خبر اہل روشن خیالی کے منہ پر طمانہ ہے۔اس کے ساتھ ساتھ یہ پرنٹ اور برقی، ہر دو میڈیا نے عائلی نظام پر اور شرم و حیا کے باب میں وہ ستم ڈھایا ہے کہ کچھ نہ پوچھیئے اب پاک دامن گھریلو عورت ..... مامتا کے رنگ میں سراپا سرشار مسلمان خواتین ریما، وینا اور سپنا تو بننے سے رہیں مگر قلبِ شوہر ہے کہ بیوی کو دیکھ کر دھڑکنے کی بجائے ڈوب ڈوب جاتا ہے اور راہوں چوراہوں پہ گری پڑی نزان قسم کی عورت سے اپنی ہوا و حوس پوری کرتا ہے غصِ بھر کا حکم اپنے اندر کیا کیا حکمتیں سمیٹے ہوئے ہے اس پر عمل نہ کرنے والے اس کی رفادیت و اہمت کو کیا جانیں؟ ادھر سطحی قسم کی سوچ رکھنے والی لڑکیوں کی بھی کمی نہیں وہ بھی سستے اور گھٹیا رومانی ناول پڑھتے پڑھتے کسی شہزادے، بانکے، سجیلے

ساتھی کے خواب آنکھوں میں بسائے رکھتی ہیں لیکن شادی
کے بعد جب اپنے رفیقِ حیات کو دیکھتی ہیں تو اکثر سارے
خواب ریزہ ریزہ ہو جاتے ہیں۔ٹوٹ پھوٹ جاتے ہیں۔
یو بقول شاعر کچھ اس قسم کی صورتحال پیش آتی ہے۔

باہم شبِ وصال غلط فہمیاں ہوئیں
مجھ کو پری کا شبہ ہوا، ان کو بھوت کا

☆☆☆

شمیم فاطمہ

یہ جو اِک مُنہ ہے.....!

معلوم نہیں آپ نے اپنا ''منہ'' دیکھا ہے یا نہیں ! (اب آپ سوچیں گی کہ یہ کیا بات ہوئی.....ہم کیا کسی جنگل میں رہتے ہیں جہاں آئینہ دستیاب نہ ہو اور ہم اپنا منہ نہ دیکھ سکیں؟ منہ تو ایسی چیز ہے کہ دیکھے بنا چارہ ہی نہیں۔آنکھ کھلتے ہی منہ دیکھنا پڑتا ہے) جی ہاں ! بجا فرمایا، دیکھا جانے والا منہ اگر اپنا منہ ہوتا ہے تو سارا دن کتنا اچھا گزرتا ہے اور نہ بھی گزرے تو آدمی ناشکری نہیں کرتا، غصہ نہیں کرتا، کسی کو برا بھلا کہنے اور برا سوچنے سے بچ جاتا ہے اور یہ نہیں سوچتا'' صبح صبح کس کا منہ دیکھ لیا تھا!'' ویسے ہمارا مشورہ مانیں تو آنکھ کھلتے ہی بند کرلیا کریں مبادا کوئی ''فٹے منہ'' دیکھنا پڑے۔ آنکھیں موندے موندے ڈائیننگ ٹیبل یا واش بیسن پہ لگے آئینے تک جائیں، جب آپکو یقین آجائے کہ آپ کے اور آئینہ کے درمیان تیسرا کوئی حائل نہیں تو دھیرے دھیرے ایسے آنکھیں کھولیے جیسے آنکھوں کے آپریشن کے بعد ہیروئن آنکھیں کھولتی ہے۔آئینے پر نظر پڑتے ہی آپ کا دل باغ باغ ہو جائے گا۔ایک دل آویز مسکراہٹ خود بخود آپ کے لبوں پر نمودار ہو کر آپ کو خوش آمدید کہے گی اور آپ شرما کر سوچیں گی کہ ''سوہنا مکھڑا تے اَکھ مستانی!'' یہ سوتے ہی سہنا مکھڑا کچھ اور سوہنا، مستانی آنکھیں کچھ اور مستانی ہو جائیں گی اور آپ آئینے کی بلائیں لیتے ہوئے گنگنانے لگیں گی کہ ''کینا سوہنا مینوں رب نے بنایا.....جی کرے ویکھدی روا ں.....'' آپ کا دل فوٹو گرافر بن جائے گا اور آنکھیں کیمرہ ۔پھر تو دائیں، بائیں ہر زاویے سے ایک تصویر.....اور ہر تصویر ایسی کہ..... دل میں اتر جائے ۔اب ہنڈیا جلے کہ دودھ ابل جائے.....(آپ کو اس سے کیا!) آپ تو آئینہ داری سے جب ہی پلٹیں گی جب آپ کے کانوں میں کچھ اس قسم کی آواز جائے گی 'ارے بی بی!.....آج آئینے کے سامنے ہی کھڑی رہو گی یا کوئی کام کاج بھی کرو گی! اس محویت کے ٹوٹنے پر آپ کے چہرے کے خوبصورت تاثرات دفعتاً یوں تبدیل ہوں گے جیسے ایک جلسے سے سیاست کا رخ تبدیل ہو جاتا ہے۔ویسے آئینہ دیکھتے ہوئے کبھی آپ کو خیال آیا کہ اگر آئینہ نہ ہوتا تو آپ یہ ''منہ'' کیسے دیکھتیں؟ کہاں دیکھتیں؟ کس سے پوچھتیں کہ'' آج میں کیسی لگ رہی ہوں؟'' کون آپ پر یوں واری جاتا اور آپ کو یقین دلاتا کہ'' آج تم بہت اچھی لگ رہی ہو!'' اور آپ مسکرا اور شرما کر ایک ادائے خاص سے کس سے کہتیں کہ'' چل جھوٹے!''

آئینہ ہمارا دوست بھی ہے، ہم راز اور دمساز بھی۔ جھوٹ بول کر خوش کر دیتا ہے۔سچ بول کر پریشان کر دیتا ہے ۔جانے آئینہ بنانے والا اپنی صورت دیکھنے کا کس قدر متمنی تھا

کہ اس نے آئینہ ایجاد کر کے ہی دم لیا۔ اگر وہ آئینہ ایجاد نہ کرتا تو آنسان کتنے غموں سے آزاد رہتا ..... نہ یہ ''چاند چہرے'' آئینہ دیکھتے نہ انہیں یہ معلوم ہوتا کہ وہ کس قدر ''چندے آفتاب! چندے ماہتاب! ہیں، نہ غرور حسن کا خناس دماغ میں سماتا نہ وہ شعراء کو عمر بھر آہ وزاری میں مبتلا رکھتے۔ نہ آئینہ ہوتا نہ غم آرائش خم وکاکل ہوتا..... نہ چشم آہو کو آلہِ قتل بنانے کے لئے نوک پلک سنواری جاتی نہ حسنِ معصوم کو حسن جہاں سوز بنانے کی سعی پیہم کی جاتی اور نہ اس مد میں ایک خطیر رقم خرچ کی جاتی۔ اور نہ حسن آرائی کو مقصود و مطلوب مومنہ سمجھا جاتا (کہ زندگی جب تک سجتی سنورتی رہتی ہے کائنات میں رنگا رنگی محسوس ہوتی ہے ادھر بناؤ سنگھار میں کمی واقع ہوئی ادھر کائنات کی ساری رنگا رنگی، سارا حسن ماند پڑ گیا۔)

نہ آئینہ ہوتا نہ کچھ لوگ اپنی صورت دیکھ کر بھونچکا رہتے ۔ نہ چیخ مار کر یہ کہتے ''نہیں نہیں!..... یہ میں نہیں .....سرِ آئینہ کوئی اور ہے!'' اپنی شکل دیکھتے ہی پھول جیسے لوگ پھول کی طرح کملا اور مرجھا نہ جاتے۔ یوں فکر مند نہ ہوا کرتے کہ آنکھوں میں یہ حلقے سے کیوں پڑ گئے ہیں؟ رنگت ایسی پیلی کیوں پڑ گئی ہے؟ یہ داغ کیسا نظر آرہا ہے؟ یہ آئینہ بنی اچھے خاصے انسان کو باؤلا بنا کر رکھ دیتی ہے نہ دن کو چین آتا ہے نہ رات کو آرام۔ ہر دم خواہش رہتی ہے کہ آئینہ ہماری تعریف کرتا رہے کبھی چودھویں کا چاند کہے، کبھی پھولوں سے حسین قرار دے، کبھی حسن کی دیوی کا خطاب دے۔ مگر آئینہ ہے کہ کسی نہ کسی نقص کی نشاندہی کر دیتا ہے اور ہم آئینے میں اپنا سا منہ دیکھ کر رہ جاتے ہیں شکر گزاری کی بجائے ناشکر کرنے لگتے ہیں (منہ دیکھ کر سوچتے ہیں کہ ''منہ نہ متھا، جن پہاڑوں لتھا)۔ ادھر رخسار پہ ایک دانہ نمودار ہوا اُدھر دل کو پریشانیوں نے چاروں طرف سے یوں گھیر لیا جیسے ملکِ عزیز کو مسائل نے گھیر رکھا ہے۔ اب اخباروں سے ٹوٹکے کاٹ کاٹ کر رکھے جارہے ہیں (ان پر عمل درآمد کی نوبت بالکل اسی طرح نہیں آتی جس طرح حکومت کو اپنے وعدوں پر عملدرآمد کی نوبت نہیں آتی) سہیلیوں سے فون کر کر کے مشورے لئے جارہے ہیں۔ بیوٹیشنز سے مشورے لئے جارہے ہیں۔ ڈرمیٹالوجسٹ کے پھیرے لگائے جارہے ہیں۔ ہربل فیشل کرائے جارہے ہیں، فیئر اینڈ لولی کا شاشا پرس میں یوں رکھا جارہا ہے جیسے ہنگامی صورتِ حال سے نمٹنے کے لئے گھریا اسکول میں ''فرسٹ ایڈ بکس'' رکھا جاتا ہے نانی، دادی حسن کو نکھارنے کے لئے اس طرح نسخے رٹواتی ہیں جس طرح ایمانِ مفصل اور ایمان مجمل رٹوانا چاہیے۔ جانے کیوں وجود زن کے لئے آبیاری حسن اتنی مقدم رکھی گئی ہے۔ آپ کی ساری خوبیاں اور اوصاف حمیدہ ایک طرف!.....آپکا حسن جہاں سوز ایک طرف!..... چنانچہ اس سنگینی حالات سے نمٹنے کے لئے کاسمیٹکس کمپنیاں متحرک اور فعال ہوگئیں۔ شہر میں جا بجا فٹنس کلب، جمز، بیوٹی پارلر، مساج سینٹرز وغیرہ ایسے کھل گئے جیسے برسات میں ندی نالوں کے منہ کھل جاتے ہیں۔ اب پارلر اور خواتین لازم وملزوم ہوئے چنانچہ گھریلو بجٹ قلیل ہونا شروع ہو گیا اور تعلقات کی خوشگواری میں

کاسمیٹکس اور فیشل کا خرچہ آڑے آنے لگا۔ مگر جب دوڑ شروع ہو جاتی ہے تو اس میں حصہ لینا بھی ضروری ہو جاتا ہے یہ کیا کہ سب بہنیں بیٹیاں تو مادھوری بن جائیں اور ہم ماسی مصیبتے بنی رہیں ..... ایسا ہرگز نہیں ہوسکتا ..... فیشل کا خرچہ ماہانہ اخراجات میں ناگزیر ہے ۔ یہ بل منظور کیے بغیر کوئی گھریلو حکومت کامیاب ہو ہی نہیں سکتی ۔

ہم تلاشِ حسن کے ایسے آرزومند ہو جاتے ہیں کہ جب قدرت ہمیں ''بہو یا بھابھی'' ڈھونڈنے کا موقع فراہم کرتی ہے تو ہم ''چودھویں کا چاند'' ڈھونڈنے لگتے ہیں (حالانکہ انشاء جی برسوں پہلے سمجھا گئے ہیں کہ ''چاند کسی کا ہو نہیں سکتا ، چاند کسی کا ہوتا ہے ؟ ۔ چاند کی خاطر ضدِ نہیں کرتے ! میرے اچھے انشاء چاند!!) مگر جب تک ہم خود نصیحت کرنے کے قابل نہ ہو جائیں کسی کی نصیحت کو گردانا ، اس پر دھیان دینا ، اس پر عمل کرنا ، اس پر غور کرنا اتنا ہی غیر ضروری سمجھتے ہیں جتنا عوامی حکومت عوامی مسائل حل کرنا غیر ضروری سمجھتی ہے اور آپ کو معلوم ہے کہ یہ چندے آفتاب چندے ماہتاب کی تلاش بھی ہم اپنے ذاتی ذوق جمال کی تسکین کے لئے نہیں کرتے بلکہ اس کے در پردہ بھی وہی ''خواہش داد'' کارفرما رہتی ہے جو ہمارے ہر کارِ خیر کو کار بد بنا کر چھوڑتی ہے ۔ ہم کسی کے ساتھ خیر خواہی کرتے ہیں تو اس کی اطلاع کسی دوسرے کو ضرور دیتے ہیں تاکہ ہمیں اپنے اخلاص کی داد مل سکے ۔ ہم اپنے روزوں کی تعداد اور زکوٰۃ کی مقدار سے دوسروں کو محض اسلئے آگاہ کرنا ضروری سمجھتے ہیں کہ لوگوں سے اپنی عبادت گزاری کی داد پاسکیں ۔ اپنی سلیقہ مندی کی داد وصول کیے بغیر کسی کام کو سلیقے سے کرنا ہمیں کسی قیمت پر منظور نہیں یہاں تک کہ ہم اپنی نااہلی کو نازک مزاجی کا لبادہ اڑھا کر زمانے سے داد وصول کر لیتے ہیں ۔ ہم محبت کریں تو داد کے خواہش مند رہتے ہیں ، خدمت کریں تو داد کے آرزومند رہتے ہیں ، عبادت کریں تو داد کی توقع رکھتے ہیں ریاضت کریں تو ..... (ریاضت کرتے ہی کہاں ہیں ..... داد کی طلب رلا دھلا کر کچھ کروا دیتی ہے سو کروا دیتی ہے) غرض یہ کہ ہماری ہر نیت ''داد'' سے آلودہ ہو جاتی ہے اور ہم بے لوثی ، بے غرضی اور اخلاص سے ایسے ہی محروم رہ جاتے ہیں جیسے پاکستانی عوام بے لوث قیادت سے محروم رہ جاتی ہے خیر ..... ہم بات کر رہے تھے اس ''منہ'' کی جو اللہ نے ہر گردن پر فٹ کیا ہے ۔ ہم اپنے اعضائے جسمانی میں منہ کو وہی اہمیت دیتے ہیں جو مغلیہ بادشاہ ''کوہ نور'' کو دیتے تھے ۔ ہماری تمام تر توجہ اسی کی طرف مرکوز رہتی ہے ۔ ہمیں اپنے پورے وجود میں اگر کوئی چیز قابل اصلاح لگتی ہے ، قابل توجہ اور قابل مرمت لگتی ہے تو وہ محض ''منہ'' ہی ہے وہی ''منہ'' جو حسینوں کا ہو تو اسے ''رخِ زیبا'' کہتے ہیں ، مہ جبینوں کا ہو تو ''چندے آفتاب ، چندے ماہتاب'' کہلاتا ہے ۔'' حکمرانوں کا ہو تو ''فٹے منہ'' کہلاتا ہے ۔ شاہوں کا ہو تو ''جلوہ'' کہلاتا ہے ۔ انسانوں کا ہو تو ''چہرہ'' کہلاتا ہے اور عام انسان کا ہو تو محض ''منہ'' کہلاتا ہے ۔ اس منہ کو دھونے کے لئے لکس ، کیپری اور تبت سوپ کی فیکٹریاں قائم کی گئیں ..... جس کو سنوارنے کے لئے ڈپلیکس بھابھیز ، روز ، ماہ روز اور ان گنت لاتعداد پارلرز وجود میں آئے ۔ جنہوں نے گیسوئے تابدار کو اور بھی

تابدار کیا۔مگر یہ ''منہ'' منہ ہی رہا اور اس منہ کا وجود انسان کے لئے ایک خطرہ ہی بنا رہا کہ جانے کونسا عمل اس منہ پر خاک مل دے اور کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہے۔کسی نیکی کا ارادہ کریں تو دھیان اس منہ کی طرف چلا جاتا ہے جسے لیے لیے ہم پھرتے ہیں چنانچہ یہ فکر لاحق ہو جاتی ہے کہ کس منہ سے سوال کریں؟ کس منہ سے درخواست کریں؟ کس منہ سے شکر کریں ؟ کس منہ سے کعبہ جائیں؟ (بھلا ہمارے پاس دو چار منہ ہیں؟ ایک اکلوتا منہ ہے جسے لیکر پیدا ہوئے ہیں اور جسے لے کر چلے جائیں گے۔ہمیں کوئی متبادل منہ میسر ہوتا تو ہم بھی اس منہ سے ایسی ایسی منہ شگافیاں کرتے کہ کلیجہ منہ کو آجاتا) عام آدمی کا منہ بھی کوئی منہ ہوتا ہے! ہر چند کہ وہ منہ میں زبان رکھتا ہے مگر اسے ساری عمر منہ بند ہی رکھنا پڑتا ہے۔عام آدمی کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہتا۔کیونکہ وہ کسی کی فرمائش پوری نہیں کرسکتا۔نہ بچوں کے لئے اچھے کھلونے لاسکتا ہے نہ اعلیٰ تعلیم دلوا سکتا ہے، نہ بیوی کے لئے زیور بنوا سکتا ہے، نہ اماں کو حج کرواسکتا ہے، نہ بیٹی کو جہیز میں پلاٹ دے سکتا ہے، نہ بیٹے کو باہر بھیج سکتا ہے، نہ بہنوں کو گفٹ دے سکتا ہے، نہ دوستوں کو قرض دے سکتا ہے ، نہ کسی سے لیا ہوا قرضہ لوٹا سکتا ہے۔لہٰذا عام آدمی عمر بھر اپنے اکلوتے منہ کو چھپائے چھپائے پھرتا ہے اور بالآخر منہ ڈھک کر سو جاتا ہے۔بیچارہ کچھ کہے تو کہا جاتا ہے ''منہ بند رکھو'' سچ بیان کرے تو کہا جاتا ہے ''چھوٹا منہ بڑی بات!'' اک ذرا اپنی تعریف کرلے تو ''اپنے منہ میاں مٹھو!'' کا طعنہ دے دیا جاتا ہے بازار جا کر بھاؤ تاؤ کرے تو دو کاندار کہتے ہیں تم اپنا منہ اٹھائے ادھر کہاں آگئے ! ایک عام آدمی بیچارے کا منہ کہاں ہوتا ہے کہ اچھے گھر میں رہے۔اچھے اسکول میں بچوں کو پڑھائے ،اچھے معالج سے علاج کروائے، اچھے کپڑے پہنے،اچھا کھانا کھائے ،اچھے خواب دیکھے! وہ تو ہر موقع پر منہ کی کھاتا ہے اور اپنا سا منہ لیکر رہ جاتا ہے اس کے پاس اس کے علاوہ کوئی چارہ نہیں کہ وہ منہ لٹکا کر جیتا رہے۔

☆☆☆

آنکھیں ترستیاں ہیں

کیسا دن آیا ہے کہ جب میں سیاہ پھاٹک میں داخل ہو رہی ہوں تو باہنیں وا کیے کوئی نہیں کھڑا ہے! یادوں میں ڈوبتی ابھرتی تحریر

بہار پھر پر پھیلائے آموجود ہوئی۔ ٹھنڈی میٹھی خوشبو میں بھیگی ہوا ہر طرف اٹھکھیلیاں کرتی پھر رہی ہے۔ بلبلیں ڈالوں پر چہک رہی ہیں۔ سبھی پیڑ نئے پیرہن میں ملبوس ہیں۔ کوئل کی مست کو کو احساس دلاتی ہے کہ سرما رخصت ہوا۔ لا تعداد چڑیاں تمام دن اپنے آشیانوں کی تعمیر کرتی ہیں ..... اللہ تعالیٰ نے رنگ و بو کا اک جہاں آباد کر دیا ہے۔ ایسے میں مَیں بہت دور ۹۲ ڈی میں پہنچ جاتی ہوں اور میرا دل چاہتا ہے کہ میلوں دور شبنم میں بھیگی ہری ہری گھاس سے پوچھوں کہ تم کو وہ قدم یاد ہیں جن کا تم منہ اندھیرے استقبال کرتی تھیں؟ اس کے پہلو میں مہکتے ہوئے سویٹ پیز سے دریافت کروں، تم بھی ان لامبی مضبوط انگلیوں کا لمس یاد کرتی ہو جو تمہاری ایک ایک ڈالی کو سہارا دیتی تھیں؟ اس کے سامنے کھلے قطار اندر قطار پھولوں سے دریافت کروں، تم کو اب بھی صبح شام سینچا جاتا ہے تو پانی ویسا ہی ٹھنڈا میٹھا لگتا ہے ؟ سر جھکائے کھڑے ٹماٹر اور بھنڈی سے پوچھوں تمہاری نائٹروجن، فاسفورس کا توازن اب کون دیکھتا ہے؟ باٹل برش کے قدیم درخت سے پوچھوں کیا تمہاری اونچی پر پیچ شاخیں اردگرد اپنے گلچیں کو کھوج رہی ہیں؟

پھر میں حق ہو کرتی فاختاؤں سے پوچھوں، غٹرغوں کرتے ان کبوتروں سے پوچھوں کیا اب بھی تم اس چمن میں اپنے پیدا کرنے والے کی حمد سنتے ہو؟ انار پر بیٹھی خاموش بلبل! کیا تم بھی قرآن پڑھتی اس لے کو یاد کر رہی ہو جو ان روشوں میں ہر صبح گونجا کرتی تھی؟ پھر ان پھدکتی چڑیوں، کو کتی کوئل، شور مچاتے کوؤں اور لالیوں سے پوچھوں کیا تم ان مناجات پر آمین کہتی ہو، جو کبھی تمہارے اردگرد ہر صبح مانگی جاتی تھیں؟ اور کیا تم یہ پرسوز آواز سنتی ہو؟

کریما بہ بخشائے برحال ما
کہ ہستم اسیر کمند ہوا

پھر میں مشرق سے ابھرتے سورج سے پوچھوں اب وہاں کتنے لوگ باقی ہیں جو جاگتی آنکھوں سے تمہارا استقبال کرتے ہیں؟ اس وسیع چھت پر چھٹکی چاندنی سے پوچھوں تمہارے نیچے ایک بستر کیوں کم ہو گیا؟ اب وہاں طویل برآمدوں میں بیٹھ کے کوئی ہوا کا رخ اور ventilation دیکھتا ہے؟

پھر میں سالوں بیتے وقت کو یاد کروں اور ان لمحوں سے پوچھوں جو دماغ میں نقش ہو گئے، جو لوحِ دل پر ثبت ہو گئے کہ وہ چار دوڑتی بھاگتی ننھی بچیوں کی گرم آغوش گرد کی چادر اوڑھے کہاں روپوش ہو گئی؟ ایک ننھے لڑکے کی سواری بنتی پیٹھ اور وہ چوڑے کاندھے کیا ہوئے؟

اور کبھی میں اس پختہ آنگن سے پوچھوں کہ وہ چوڑی

پیشانی کیا ہوئی جو تجھ پر سجدہ ریز ہوتی تھی؟ اس وسیع صحن میں پھیلی دھوپ سے پوچھوں اور ٹھنڈے سایے سے پوچھوں کہ اب سردی گرمی میں زمین پر بیٹھا کون اپنے بچوں کو ہوم ورک کرا رہا ہے؟ ب کس کو ان کے لب ولہجہ درست کرانے، املا یاد کرانے اور وکٹورین لہجے میں انگریزی سکھانے کی فکر ہے؟ اور پھر میں چھولوں اس شفیق ہاتھ کو جو گدی سے چٹیا کھینچ کے ان چھوٹے بچوں کے سر کا زاویہ درست کرتا تھا اور کبھی وہ آواز سنوں،

''کمر سیدھی رکھو'' ''کتاب اونچی کرو'' ''گردن جھکاؤ اپنی غلط پوزیشن سے اعصاب مت تھکاؤ تھکو گی تو کام کیسے کرو گی؟'' کیا اب بھی وہاں کوئی حاصر باش نگران بیٹھا ہے جو روشنی کی سمت دیکھتا ہے، '' لکھتے ہوئے روشنی ہمیشہ بائیں جانب سے آنی چاہئیے۔ روشنی کتاب پر ڈالو، آنکھوں پر نہیں۔'' ''نیم روشن کمرے میں مت پڑھو۔ یہ آنکھیں اللہ کی نعمت ہیں، اپنی غفلت اور جہالت سے انہیں خراب مت کرو۔''

اور خستہ ہوتی تختیوں سے پوچھوں، چند بکھری قلم دواتوں سے پوچھوں، اب کون اپنے بچوں کو خوش خطی کی مشق کراتا ہے؟ پھر میں زمین پر بچھی چٹائی سے پوچھوں، یہ کیا میلہ لگا ہے جہاں ایک باپ پانچ بچوں کو لئے ان کے بستے کھولے بیٹھا ہے؟ کیا اب بھی وہاں تعلیمی سال کے آغاز پر بچوں کی کتابیں جلد ہوتی ہیں؟ اور اب بھی کوئی باپ دسیوں کاپیوں پر خاکی کاغذ چڑھا، قلم منگا جلی حروف میں نام لکھتا ہے؟ پھر پلاسٹک کور چڑھا کے یہ کون بولا ہے'' چل بھئی داب دے دے۔'' اور گھر کی سب موٹی کتابیں یا کونڈی ان نئی غلاف چڑھی کاپی کتابوں پر بوجھ کے لئے رکھی جارہی ہیں .....کبھی میں نیشنل کے پرانے ریڈیو سے پوچھوں اب صبح چھ بجتے ہی کون ٹیون سیٹ کرتا ہے کہ اس کے بچے اچھے لحن سے پڑھتا قرآن سنیں؟ اور ایک پرانے ردی ہوئے ٹی وی سے پوچھوں، تین بجے ''اقراء'' سننے کے لئے کھولا جاتا ہے'' اب وہ کس کے بچوں کی تجوید درست کراتا ہے؟ قرآنی قاعدوں کے ڈھیر سے پوچھوں کہ قاریوں سے نہ پڑھنے والے کو کیسے فیصل مسجد کے امام صاحب کا سلام بھیجا جاتا ہے؟ (قرآن کی درست ادائیگی کی فکر نے انہیں اپنا لہجہ درست کرنے پر ابھارا پھر بعد فجر اپنے بچوں کا قرآن سننا، حفظ والوں کا سبق اور دہرائی کرانا روزانہ کا معمول تھا۔)

پھر میں وہاں پھیلی کتابوں میں دیکھوں کہ صرف ونحو کی کتابیں اب کون پڑھتا ہے؟ مولانا تھانوی کے مواعظ اب کس کے لئے منارہ نور ہیں؟ اب کون گھنٹوں '' بیان القرآن'' کھولے بیان تیار کرتا ہے؟ کیا اب وہاں، ضَرَبَ ، ضَرَبَا ، ضَرَبُوا، کی گردان گونجتی ہے؟ کیا اب کوئی عربی فارسی سکھانے کے لئے ''ٹیوشن لگواتا ہے؟'' کیا اب وہاں بو علی سینا کی القانون کا کوئی قدردان ہے؟ کیا کبھی میں دیکھ سکوں گی کہ میڈیکل ڈاکٹر طب کی پرانی کتابیں کھولے کھرل پر سرمہ پیس رہے ہیں؟ بہشتی زیور کے نسخے آزمائے جارہے ہیں۔ یہ سرمہ اناراں ہے۔ یہ عرق جالینوس ہے۔ یہ نمک سلیمانی ہے۔ یہ ڈبیا، ہینگ کی اور وہ ملٹھی رکھی ہے۔ کانچ کے ان مرتبانوں میں اب کون سی چٹنی مربے رکھے ہیں

؟

یہ کیسی کایا پلٹی ہے کہ بے ریش چہرے کے ساتھ سوٹ ٹائی میں ملبوس نوجوان جونشتر میڈیکل کالج گیا تھا اپنی ڈگری کے ہمراہ گھنی داڑھی بھی لے کر آیا۔ کھانے پینے، ہلے گلے، تیز ڈرائیونگ کے شوقین، بہت اپ ٹو ڈیٹ اور ماڈرن ابا .....مشن اسکول اور ایف سی کالج کے کٹر مسیحی اساتذہ سے دین بیزاری اور مغرب پرستی کے سبق پڑھ کر، جب مولانا خیر محمد صاحب (مہتمم مدرسہ خیر المدارس، ملتان) سے بیعت ہوئے تو پھر کسی نے انہیں مغربی لباس اور طور اطوار اپنائے نہ دیکھا۔ خاندان کی مخالفتا ورطنز واستہزاء کے باوجود داڑھی نہ منڈائی۔ مرشد نے سکھا دیا تھا کہ راہِ سلوک طے کرنی ہے تو قلتِ کلام، قلت طعام، قلت منام اور قلت مع الانام کو لازم پکڑو.....اور انہوں نے اسے پورا کر دکھایا.....جبھی میرا دل چاہتا ہے کہ ۹۲ ڈی کے کشادہ لاؤنج کے درو دیوار سے پوچھوں کہ اب وہاں کھانے کی میز کے گرد، آرام سے کرسی پر بیٹھ کر کسی کے لب ہلتے ہیں اور کیا کسی کی انگلیاں تسبیح کے موتی پروتی ہیں؟ کیا وہاں سب میں بیٹھے کھانا کھاتے بے ساختہ کوئی آواز ابھرتی ہے، اللھم صلی علی النبی.....اور کبھی کوئی فہماش ہماری بے مقصد ہنسی کو بریک لگاتی ہے، ''فضول باتوں میں وقت نہ ضائع کرو۔ اٹھو کام میں لگو۔'' اور کبھی وہ منت سماجت جو وہاں ہوا کرتی تھی، ''ابا کپڑے نئے بنالیں۔'' ''جوتا پالش کرالیں'' ''یہ پرانی چادر نہ اوڑھیں یہ تہبند نہ پہنیں۔''

''چل ہٹ جھلی! میں کوئی سسرال چلا آں'' اُدھر سے کمال بے نیازی سے فرمایا جاتا.....

کیا پھر کبھی میں دیکھوں گی وہ باریک خندہ لب جو چار بیٹیوں کے لئے شفقت لٹاتے تھے؟ ان بیٹیوں کو جنہیں کبھی یہ احساس نہ ہو سکا کہ ان کے معاشرے میں بیٹوں کی قدر بیٹیوں سے زیادہ ہے۔ جنہیں ان کے باپ کی محبت نے اعتماد بخشا۔ جنہیں شاید لاشعوری طور پر وہ گھر کی ہر ذمہ داری اٹھانے کے لئے تیار کرتے رہے۔ خریداری سفر مالی لین دین، بینک کے معاملات، پڑھائی، ڈرائیونگ سب سے خود کو ''بڈھا باپ'' کہہ کر کنارہ کش ہوتے رہے۔

کیا کہیں ایسی بھی ہوتا تھا کہ گھر داری کی تربیت باپ کرتے ہوں؟ ان کے خیال میں سات سال کے بچے کو نماز پڑھانا ضروری تھا تو ساتھ ہی ساتھ گھر داری کی مشق کا آغاز بھی لازم تھا۔ پیڑا کرانا، روٹی بیلنا لگوانا پھر کچے پکے نقشے کھا کر حوصلہ افزائی کرنا، ''فکر نہ کر، مشق سے تو بندر بھی کام سیکھ جاتے ہیں، تم تو اشرف المخلوقات ہو۔'' وہ مشق آج تک جاری ہے۔ چاول پکانا انہوں نے سکھائے۔ پلاؤ خشکہ، بھات۔ اب کون ہمیں بتائے گا کہ بگھار دے کر جب پانی ڈالنے کا مرحلہ ہو تو گنتی یوں ہوتی ہے۔

''برکت، دو تین، چار .....''؟ گوشت کی تقسیم اور پیکٹ بنانے، کچن کے ہر کام میں آغاز اسی طرح تھا۔ ''برکت .....'' اس برکت کے حصول کے لئے پلیٹ پونچھی جاتی تھی۔ سالن ڈونگے میں نکالا جاتا تو خالی دیگچی ابا کے سامنے دھری ہوتی اور وہ روٹی کے نوالے یا انگلی سے پونچھا کرتے۔'' کیا خبر برکت کس حصے میں ہو'' بچے ہوئے سالن

، باسی روٹی پھینکنے کی اجازت نہ تھی۔ وہ اگلے وقت cock tail کی شکل میں نیا جنم لے کر دسترخوان پر موجود ہوتی۔

اوراب کون یہ دیکھے گا کہ سبزی کاٹنے کے لئے صحیح رخ کونسا ہے؟'' تنے سے جڑ کی طرف کاٹو تو جلدی کٹ جائے گی۔'' گرم دیگچی کو کیسے پکڑ کر الٹانا ہے کہ ہاتھ اور منہ گرم بھاپ سے نہ جلیں۔گھر باورچی خانے میں سائنس کا استعمال اب کون سکھائے گا؟ وہ فرماتے

''بھاپ کا درجہ حرارت زیادہ ہوتا ہے اور ابال کا کم۔ سو آلو کو بھاپ میں دم دو، ابالو نہیں۔'' سبزی کو بھاپ میں پکانا ہوتا تھا بھوننے کی اجازت نہ تھی کہ وٹامن ضائع ہوتے ہیں۔سبزی ایسے پکانا کہ وہ بگھاری بھی جائے اور اسکا قدرتی رنگ بھی نہ خراب ہو، کیسا نازک آرٹ تھا۔

کبھی دل چاہتا ہے کہ میں باورچی خانے میں آگ کے لپکتے شعلوں سے پوچھوں کہ کون اب تمہاری کیمسٹری پڑھتا ہے ؟ سوڈیم، پوٹاشیم ، کلورائیڈ، فاسفیٹ ، نائٹریٹ..... یوریا ، کاپر سلفیٹ،سٹرک ایسڈ، کاربونک ایسڈ، تیزاب اساس کا کیمیاتی عمل، پروٹین ، کاربوہائیڈریٹ ،نمکیات ،وٹامنز ..... یہ سب علم کیمیا کی کتب سے پہلے تو باورچی خانے میں پڑھائے گئے تھے۔

vapour pressure کی تعلیم دینے کے لئے پتیلے کا ڈھکن بند کر کے پکانا سکھایا۔''وقت بچاؤ، وقت قیمتی ہوتا ہے ۔''

پھر کبھی میں ایک پرانے گھڑیال کی ٹک ٹک کرتی سوئیوں سے پوچھوں کہ اب وہاں کس کا معمول نظم وضبط سے بندھا ہے؟ سونا جاگنا، کھانا پینا، ملنا جلنا حتی کہ بیت الخلاء جانا بھی مقررہ وقت پر طے تھا۔ ذرا سی اونچ نیچ پر یہ تنبیہہ اب کون کرے گا۔

''حیوانوں کی طرح مت جیو انسانوں کی سی عادات اپناؤ۔''

انسانوں کی سی عادات میں ضروری تھا کہ صحت مند طرز زندگی اپنایا جاتا۔کھانا دو وقت ہی ملتا تھا کہ بسیار خوری قابل نفرین سمجھی جاتی تھی ۔ غذائی مخروط(food pyramid) کے مطابق گھر کی فہرست مرتب ہوتی تھی۔کم کولیسٹرول، زیادہ فائبر والی غذا۔انکے لئے روٹی کے ساتھ زیتون کا تیل، اچار، دھنیے پودینے کی چٹنی یا سرکے میں بھیگی پیاز اور کچی سلاد بہت مرغوب غذا تھی .....اور کبھی میں بی آر بی نہر کے کنارے بنے بنکر اور مورچوں سے اور واہگہ پر کھینچی گئی سرحدی لکیر سے پوچھوں کہ وہ کیا جذبہ تھا جو وہ اپنے بچوں کو لیے یہ سب دکھاتے تھے، پھر جوش سے انکا لہجہ بلند ہو جاتا تھا اور کبھی شدت جذبات سے آواز رندھ جاتی تھی جب وہ آنسوؤں کے ساتھ مشرقی پنجاب سے اپنی ہجرت کی تفصیل سناتے تھے۔ پھر ۶۵ء کی جنگ کی روداد، اپنے حکمرانوں کی ناعاقبت اندیشی، لالے کی عیاری اور پاکستانی فوج کی بہادری کی داستانیں سناتے ، بھارتی سرحد کے ارد گرد علاقے کی سیر کراتے تاریخ کو مجسم دکھایا کرتے تھے۔ ہم سنتے ، جذبہ حب الوطنی بڑھاتے ،فوجیوں سے ہاتھ ملاتے ۔شہری دفاع کے سبق پڑھتے .....شاید اس کا اثر تھا کہ ہندو سے مشابہت بہت ناگوار تھی۔ محلے میں ''ارجن'' (درخت)

اور ''اشوکا'' (پودا) لگانے کا فیشن تھا مگر وہ کہتے تھے کہ اچھے تو لگتے ہیں لیکن ان سے ہندو کی یاد آتی ہے۔ سو آخر تک وہ اپنے چمن میں سرو کاشت کرنے میں کوشاں رہے کہ یہ مغلوں اور کشمیر کی یادگار ہے۔

.....پھر میں دیکھوں کہ کیا اب چمن میں کرسی ڈالے کوئی ''ارتھ شاستر'' پڑھتا ہے؟ Jewish conspiracy اور پروٹوکولز کسی کی دلچسپی کا موضوع ہیں؟ اب کس کو وہاں تاریخ اسلام پڑھنے پڑھانے کا شوق ہے؟ وہ بہت شوق اور ولولہ سے مسلمانوں کے عروج کی داستانیں سناتے اور زوال کے افسوسناک واقعات۔ اکثر کہتے۔

''سب تاریخ پڑھ جاؤ، ایک ہی سبق ہے۔ مسلمان جنگوں میں نہیں ہارتے، انتشار اور نفاق ان کی بیماری ہیں۔ میر جعفر و میر صادق ان کی جیتی ہوئی بازی دشمنوں کی گود میں ڈال دیتے ہیں۔''

کبھی کہتے، ''کفر کے نام بہت ہیں۔ حقیقت ایک ہے۔ الکفر ملۃ واحدۃ۔ اس کا مقابلہ باہمی اتفاق اور اتحاد سے کیا جاتا ہے۔ قوتیں بچاؤ اور دشمنوں سے ٹکراؤ۔ آپس میں لڑ کر دشمن کا کام آسان نہ کرو۔''

۹۲ ڈی کے وسیع لان اور اونچے روشن دانوں سے جھانکتی گلہریاں گواہ ہیں کہ ابا کے گھر میں تحریکی لوگوں سمیت سب نیک لوگوں کی آمد و رفت تھی۔ مولانا تھانوی سے ارادت مندی تھی۔ جامعہ اشرفیہ اور نیلا گنبد کے علماء سے ملاقات، ان کے بیانات میں شرکت، کبھی ان کی دعوت کرنا اور ہمیں ان کے گھروں میں بھیجنا.....

''علماء کا احترام کرنا، دین کا اکرام کرنا ہے۔''

امی کتنے برس مدرستہ الفیصل للبنات میں طبی خدمات فراہم کرتی رہیں۔ مولانا وکیل احمد شیرانوی کی والدہ (حضرت جلیل احمد خلیفہ حضرت تھانویؒ کی اہلیہ) تو ہماری ''دادی اماں'' تھیں۔ صالحین کی نشست اور بزرگوں کی زیارت سے فیض پانے کا یقین ہوا کرتا تھا، خود سلسلہ چشتیہ امدادیہ (منسوب بہ حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ) سے بیعت تھے۔ ڈاکٹر اسرار احمد صاحبؒ سے بھی ملاقات تھی۔ انجمن خدام القرآن کی کتب ہمارے زیر مطالعہ رہتی تھیں۔ تبلیغی جماعت کے گشت میں شرکت ہوتی تھی۔ الہدیٰ کی مدرسات آتی تھیں۔ طلبہ و طالبات ڈاکٹر، اساتذہ سب کی جماعتوں کے لئے ابا کے گھر کے دروازے کھلے رہتے۔ انکا خیال تھا کہ۔ دین اسلام بہت وسیع ہے۔ ''صلحاء کسی ایک جماعت میں نہیں، جملہ اہل اسلام میں ہوتے ہیں اور کبھی میں اک پرانے ٹائپ رائٹر پر تسلسل سے بجنے والی ٹک ٹک سنوں اور کبھی ایک پرانے کی بورڈ سے پوچھوں کہ کیا تم ان لمبی انگلیوں کے پوروں کا لمس محسوس کرتے ہو جو گھنٹوں مختلف مسودات ٹائپ کیا کرتی تھیں۔

انگریزی ٹائپ اور کمپوزنگ کا ہنر تو خوب جانتے تھے۔ بعد میں اپنے خاندان کی علمی و نسلی تاریخ مرتب کرنے کا خیال آیا تو اردو کمپوزنگ بھی سیکھ لی۔ شجرہ نسب مرتب کیا اور بڑی محنت سے اپنے سلسلے کا شجرہ بھی لکھا۔ کہا کرتے تھے کہ نسب کو محفوظ کرنے کا تو نانا پاک (ﷺ نے حکم دیا ہے) نانا پاک کے تتبیع میں ہی خاندان بھر کی مخالفت کے باوجود

داڑھی رکھی، بڑھائی اور بالوں کے پٹے بنائے۔ پھر کبھی میں اس سفید ننھی سی گاڑی کے گھومتے پہیوں سے پوچھوں کہ یہ کیا جذبہ تھا کہ وہ گھومنے پھرنے اور سیر کے شوقین نہ ہونے کے باوجود اس میں ہمیں لیے نتھیا گلی سے پنجند تک بے شمار جگہوں پر لے کر گئے ..... دوران سفر ہر علاقے کی خصوصیات، تاریخ، اہم مقامات اور نباتات کا بیان جاری رہتا..... لاہور کے تاریخی مقامات بہت مرتبہ دکھائے مگر یہ ہمیں کبھی معلوم نہ ہوسکا کہ ''لاہوری ناشتہ'' کہاں ملتا ہے۔ سری پائے، ہریسہ، نہاری کہاں کھائی جاتی ہے؟ باربی کیو اور چائنیز کہاں اچھا ہوتا ہے؟ بازار کی ہر چیز تو ''بڑا گند'' کی مہر لگا کر ممنوع تھی۔ ''ایہہ گند بلا ساڈھے کھان آلائیں'' جو چیز کھانی ہے گھر میں بناؤ۔ ہم چھوٹی تھیں تو وہ ہمارے لئے کرسپی چپس اور کاک ٹیل بناتے تھے۔ ٹافی کے تقاضے پر کھجور تھمائی جاتی۔ پھر بعد میں ہم خود طرح طرح کے تجربے کرتی رہتیں۔

پھر چنبیلی اور موتیے کے پھیلے جھاڑ سے پوچھوں، سر اٹھائے سرخ گلابی لالے میں جھانکوں کہ تمہیں وہ بھوری آنکھوں سے بہتے خوشی کے آنسو یاد ہیں جو پاکستانی سپریم کورٹ کے سود کے خلاف فیصلے کی تحسین کررہے تھے؟.....اسلامی نظام اور عالم اسلام کے بارے میں تو وہ بہت حساس تھے۔ پاکستان میں شرعی قوانین کا نفاذ ہو یا افغانستان، فلسطین کا جہاد، بوسنیا، چیچنیا می برسرِ پیکار مسلمان، ہر ایک کے لئے وہ آنکھیں خوشی یا فکرمندی کے آنسو بہاتی تھیں..... برسوں پہلے جب بہن بھائی دور دیس (امریکہ) جا بسے تھے اور ان کو بھی پُرزور بلاوا تھا بلکہ عدم اطاعت پر بڑے بھائی ناراض تھے اور ان کے مستقبل میں تاریک کیریئر کی پیش گوئی کررہے تھے مگر وہ یہی کہتے تھے، ''رزق اپنے مقدر کا یہاں بھی مل جائے گا البتہ دارالکفر میں دین ہاتھ سے جاتے رہنے کا خطرہ ضرور ہے۔'' وقت نے ان کے مرشد کے اس قول کو سچا ثابت کردیا..... جو اکیسویں صدی کے آغاز پر، خود ڈاکٹر ہوتے ہوئے دینی تعلیم کے حصول پر زور دیتے تھے۔ ہمارے لئے عربی اور شریعہ کی تعلیم پسند کی۔ اس میں ڈاکٹریٹ کرانا ان کی بڑی خواہش تھی۔ ''مولوی'' جو خاندان میں استزاء کی علامت سمجھا جاتا تھا، ان کے نزدیک قابل احترام عالم کا لقب تھا دینی تعلیم کے بغیر حاصل کردہ ڈگریاں، کسی کو ان کی نظر میں ''جاہل'' دانا و بینا نہ بنا پاتی تھیں۔ پھر کبھی میں میلوں دور اس کالے گھر سے پوچھوں کہ اب کتنے طواف کرنے والوں کے ہمراہ ان کی ہدایات ہوتی ہیں وہ گھر جس کے لئے ان کے شوق کا یہ عالم تھا کہ وہ اس کے ذکر سے آنسوؤں سے روتے تھے۔ کیسے اپنے حج کے بعد انہوں نے خاندان کے بہت سوں کو حج کے لئے باصرار آمادہ کیا۔ کتنی بھانجیوں کے تنہا محرم بن کے یہ فریضہ ادا کرایا۔ درخواست کی منظوری کے بعد سب سے بڑھ کے وہ تیاری کرتے تھے۔ ہمیں فکرمند نہ دیکھ کر کیسے غصہ کرتے تھے، ''وہ سیر کی جگہ نہیں کہ اتنا روپیہ خرچ کر کے'' جہلاء'' کی طرح گھوم پھر کے واپس آجاؤ۔'' حج عمرہ کے شرعی طریقے اور وظائف پر مشتمل مختلف مکاتب فکر کی کتب کا مطالعہ پھر اسکا خلاصہ تیار کرنا..... اپنے تجربات اٹھتے بیٹھتے زادراہ بناتے.....

اُدھر کبھی میں اس سبز گنبد کے پاس جاؤں اور بقیع پر اڑتے کبوتروں سے پوچھوں کہ جناب سیدہ (رضی اللہ عنہا) کے ابا جان (ﷺ) نے اپنے رب سے میرے ابا کے لئے بھی سفارش کی ہوگی؟ وہ جوان کے لطف وکرم کے جو یا تھے ، جو پُر امید رہتے تھے کہ

اللہ تُو کریم رسول تُو کریم
صد شکر کہ ہستم میان دو کریم

پھر میں کہوں کہ اے جملہ جہاں کے رب تو اپنے بندے کا یہ گمان بھی سچا کر دے، جو اس کے لبوں کا ترانہ رہا،

عصیانِ ما و رحمت پروردگار ما
ایں را نہایتے و نہ آں را نہایتے

پھر میں اپنی پرعزم ماں سے پوچھوں جو زندگی کی شام میں تنہا رہ گئی کہ ہر دم اسکا ساتھ نبھانے والے نے اب کہاں جا بسیرا کیا؟ وہ جو باورچی خانے سے لے کر لانڈری تک گھر کے ہر کام میں ہاتھ بٹاتا تھا۔ جس نے بیاہ کے بعد اپنی سب بیرون خانہ مصروفیات چھوڑ کر دفتر کے بعد تمام وقت گھر کو دینا شروع کر دیا تھا..... امی ابا دو مختلف نظریاتی گروہوں سے وابستہ تھے۔ گھر میں مولانا تھانویؒ کے مواعظ بھی پڑھے جاتے تھے اور سید مودودیؒ کا لٹریچر بھی۔ مجلس صیانتہ المسلمین کے بیان بھی سنے جاتے تھے اور جمعیت، جماعت کے دروس بھی۔ مگر گھر میں کبھی تناؤ محسوس نہیں ہوا۔ وہ ہمارے سامنے آپس میں کبھی اختلاف نہ کرتے ۔ یہاں تک کہ ہمیں ''حزب اختلاف'' کو توانا بنانے کے لئے ''متحدہ بچہ محاذ'' قائم کرنا پڑا۔ جس کی آواز امی ابا کی مشترکہ اصولی پارٹی کے مقابلے میں صدا بصحرا ہی رہی ..... انکا موقف تھا کہ میاں بیوی کو اللہ پاک نے ایک دوسرے کی آنکھوں کی ٹھنڈک اور باعث سکون قرار دیا ہے، چھوٹے چھوٹے اختلافات سے اسے جہنم نہیں بنانا چاہیے ..... چند اصولی معاملات کے علاوہ ہمارے لئے کھلی آزادی تھی۔ وہاں وہ اپنی رائے نہ ٹھونستے تھے نہ منواتے تھے۔ اکثر خاموش رہتے اور کہتے تو یہ کہ تم میرے معاملے (domain) میں ٹانگ نہ اڑاؤ، میں تمہارے اُمور میں دخل اندازی نہیں کرتا۔''

اور اب یہ کیسا دن آیا ہے کہ جب میں اس سیاہ پھاٹک سے داخل ہو رہی ہوں تو بانہیں وا کیے کوئی نہیں کھڑا ہے۔ یہ سب کی آنکھوں میں موتی کیوں جھلملا رہے ہیں؟ یہ ابا کی نشست کے پاس چادر اوڑھے کون سو رہا ہے؟ یہ چند لمحوں میں کیا ہو گیا ہے؟ باہر پانی کا پائپ اسی طرح لگا ہے۔ کیاری میں کھرپی ایسے ہی رکھی ہے جیسے ابھی کوئی آ کے کام شروع کر دے گا یہ کمرے کے دروازے کے پاس جوتا تو ابھی اتارا ہے اور کھونٹی پر کرتا بھی لٹکا ہے کہ گویا ابھی اسے پہننا ہے ..... اور یہ لوگ کیوں اکٹھے ہو گئے؟ اور اب یہ پھولوں میں گھرے میرے ابا کو کہاں لیے جا رہے ہیں؟ یہ ابا ان کے کاندھوں پر کیوں سوار ہو گئے؟ پھر یہ تہہ خاک کسے چھوڑ آئے؟ میرا جی چاہا کہ پکار کے پوچھوں۔

''لوگو! تم نے یہ کیسے گوارا کر لیا کہ میرے باپ کو منوں مٹی تلے تنہا چھوڑ آئے؟''

پھر میں اس وقت کو سوچنے لگی جب سیدہ فاطمہؓ کے باپ (ﷺ) اپنے رفیق اعلیٰ کے پاس پہنچ گئے تھے۔ ہائے

! وہ کیسا وقت تھا۔ جب عمرؓ جیسے دانشمند کہہ رہے تھے، ''جس نے کہا کہ نبی ﷺ وفات پا گئے ہیں، میں اس کی گردن اڑا دوں گا۔'' موت .....! یہ کیسی حقیقت ہے؟ پھر ابو بکر صدیقؓ آتے ہیں۔غم واندوہ کی تصویر بنے، مسلمانوں کو یاد دہانی کراتے ہیں۔

''اگر کوئی محمد ﷺ کی بندگی کرتا تھا، تو وہ اس جہان سے تشریف لے گئے اور اگر کوئی اللہ کی بندگی کرتا تھا، تو اللہ زندہ ہے۔اس کے لئے کبھی موت نہیں۔''

اُسی اللہ نے فرمایا ہے، ''کل نفس ذائقۃ الموت''..... اس کے حبیبؐ وخلیلؑ دنیا کے بہترین انسان .....انسانوں کے رہنما ..... سب جلیل القدر نبی..... سبھی موت کی ردا اوڑھے اس زمین کی پہنائیوں میں روپوش ہو گئے۔ کتنے ہی وقت کا دھارا بدلنے والے..... کیسے ہی پیارے، کتنے محبت کرنے والے..... بہت سے ''ناگزیر'' لوگ۔سب نے قبرستان جا آباد کیے۔کیا وہ مر گئے؟ کیا زندگی ختم ہوگئی؟..... نہیں نہیں۔ یہ تو ہمیشہ کی زندگی کا آغاز ہے..... جدائی؟ یہ تو عارضی جدائی ہے۔پھر ہمیشہ کی ملاقات ہے۔ یہ کون مجھے تسلی دے رہا ہے۔ وہی رب کہ موت جس سے ملاقات کا نام ہے پکار پکار کے کہتا ہے،

كل من عليها فان ويبقى وجه ربك ذوالجلال و الاكرام

☆☆☆

ڈاکٹر ثمین ذکا

داستانِ عطا و بخشش

دلوخورد کے شب و روز

درسگاہ میں کم و بیش پچاس لڑکیاں تعلیم حاصل کرتی ہیں اور چونکہ دوسرے شہروں سے آتی ہیں اس لیے ہوسٹل میں رہائش کا بندوبست ہے۔ نوجوان بچیاں ہوتی ہیں سو ہمیں ان کی تعلیم کے ساتھ تربیت کا بھی کافی خیال رکھنا ہوتا ہے۔ ساتھ ہی لڑکیوں کا سکول ہے جو مڈل سے اب میٹرک تک ترقی کر چکا ہے۔ کچھ لڑکیاں پرائیویٹ ایف اے کا بھی امتحان دیتی ہیں۔

محترمہ ام راشد کی تین بیٹیاں بلامعاوضہ یہاں اساتذہ کے فرائض سرانجام دیتی ہیں۔ بڑی دونوں پرنسپل اور ہیڈ مسٹریس ہیں، تیسرے نمبر پر حمیرا ہیں جو کہ درسگاہ کی انچارج ہیں۔ ان لوگوں کو گاڑی مہیا کرنا ٹرسٹ کی ذمہ داری ہے۔

شفاخانہ جمعرات کے روز کھلتا تھا۔ شروع میں ڈاکٹر زینب میرے ساتھ ڈیوٹی کرتی تھیں۔ پھر کچھ سال ڈاکٹر جمیلہ حفیظ اور ڈاکٹر ساجدہ احمد کام کرتی رہیں۔ مسز ثریا حمید بھی بہت اچھی مددگار ثابت ہوئیں۔ چند سال قبل یہ ڈسپنسری بند کرنا پڑی کیونکہ اس جگہ اب زچہ بچہ سینٹر کی تعمیر کا منصوبہ بنایا گیا ہے۔ زمین موجود ہے تعمیر کیلئے رقم کا بندوبست ہوتے ہی انشاءاللہ کام شروع ہو جائے گا۔

اللہ کے کرم سے کافی سال پہلے میں نے دلوخورد کی درس گاہ کے بارے میں ایک بہت اچھا خواب دیکھا تھا..... صحن میں سفید چادریں بچھی ہوئی ہیں۔ محفل سیرت سجی ہے۔ ٹرسٹ کی سب بہنیں بیٹھی ہوئی درود پاک پڑھ رہی ہیں۔ رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم سفید گھوڑے پر سوار اوپر کی طرف جا رہے ہیں۔ میں نے سفید کپڑوں میں ملبوس ان کی پشت کا دیدار کیا۔ پھر یکدم وہ آنکھوں سے اوجھل ہو جاتے ہیں۔ آنکھ کھلنے پر ایک عجیب سی ٹھنڈک کا احساس تھا اور ایسے محسوس ہو رہا تھا ساری فضا معطر ہے! تب سے ہم ہر سال محفل سیرت منعقد کرتے ہیں درسگاہ میں یا میرے گھر میں۔

اللہ تعالیٰ کی مدد کے غیر معمولی واقعات آپا ام راشد کو بھی پیش آتے ہیں۔ چند ماہ پیشتر جو اللہ کی خصوصی مدد انہیں ملی اس کا دلچسپ قصہ انہوں نے یوں سنایا: ''ایک شام ہمارے ایک پرانے جاننے والے ریٹائرڈ میجر صاحب تشریف لائے اور کہنے لگے، کام مشکل ہے مگر اُمید ہے آپ انکار نہیں کریں گی۔'' میں نے کہا بتائیں کوشش کروں گی مشکل حل ہو جائے۔ وہ بولے دس لاکھ روپے کل شام تک چاہئیں۔ میں ذرا سوچ میں پڑ گئی مگر پھر جلد ہی ان سے وعدہ کر لیا کہ کل آپ اسی وقت تشریف لے آئیں۔''

میجر صاحب چلے گئے۔ ابھی گھنٹہ بھی نہ گذرا تھا کہ میرے منجھلے بیٹے عامر کا فیصل آباد سے فون آیا ''میرا ایک دوست نو لاکھ روپے آپ کے ہاں صبح پہنچائے گا آپ سنبھال لیں۔''

''ٹھیک ہے'' میں نے کہا اور فون بند ہو گیا۔ صبح تقریباً دس بجے عزیز نو لاکھ کی رقم لائے اور کہا ''چند ماہ کیلئے یہ امانت رکھ لیں''۔

میرے ذہن میں میجر صاحب کا مسئلہ موجود تھا۔ میں نے ان سے پوچھا کیا تین ماہ کیلئے یہ رقم استعمال کی جا سکتی ہے؟ انہوں نے بخوشی اجازت دے دی۔ اللہ کی طرف سے نو لاکھ کا بندوبست بیٹھے بٹھائے ہو گیا تھا۔ اب باقی ایک لاکھ رہ جاتا تھا۔ میجر صاحب نے تین ماہ میں قرضہ واپس کرنے کا وعدہ کیا تھا۔

میں سوچ میں پڑی تھی کہ کہاں سے بندوبست ہو گا، اچانک یاد آیا میرے بڑے بیٹے راشد نے ایک لاکھ کی رقم میرے پاس چند ماہ پہلے امانت رکھوائی تھی۔ اس کو کراچی فون کیا اور اجازت طلب کی کہ اگر وہ رقم تین ماہ کیلئے استعمال کر لیں۔ بیٹے نے بھی بخوشی اجازت دے دی۔

شام کو میجر صاحب آئے اور رقم لیکر روانہ ہو گئے۔ وعدے کے مطابق ڈھائی ماہ بعد ہی وہ پورے دس لاکھ واپس لے آئے اور ساتھ اپنے مسئلے کی وضاحت بھی کر دی۔

''ایک زمین کا سودا ہوا تھا۔ بیعانہ پانچ لاکھ دے دیا تھا، اب بقایا دس لاکھ مقررہ تاریخ پر نہ دیتا تو بیعانہ بھی ضبط ہو جاتا'' پھر انہوں نے بتایا ''میری زمین بکنے میں کچھ تاخیر ہو گئی تھی اس لیے آپ سے قرضہ لینا پڑا۔ اب بک گئی ہے اور آپ کی رقم شکریہ کے ساتھ واپس کرنے آیا ہوں۔''

ام راشد نے دوسرا غیبی مدد کا واقعہ بھی سنایا:

ایک روز ان کے منجھلے بیٹے ناصر کا بچپن کا ایک دوست اپنی پریشانی کا حل تلاش کرنے آیا۔

وہ کہنے لگا: ''ہمارا ٹینٹ سپلائی کا کاروبار ہے۔ زیادہ آرڈر آرمی سے آتے ہیں کچھ نا معلوم وجوہات کی بنا پر ہمارے آرڈر بند کر دیے گئے ہیں اس وجہ سے سخت پریشانی لاحق ہو گئی ہے۔ آپ کے پاس آیا ہوں ہو سکتا ہے کوئی بہتری کی سبیل نکل آئے۔''

ام راشد بتاتی ہیں کہ صرف چند روز پیشتر ہماری ایک ساتھی مسز اخلاص نے ایک کثیر رقم دی تھی کشمیر کے زلزلہ والے علاقوں میں ٹینٹ بھجوانے کے لیے اور یہ ابھی سوچ ہی رہی تھیں کہ کس سے رابطہ کرنا چاہیے؟

مشکل کشا حاجت روا رب نے مطلوبہ بندہ ان کے گھر بھیج دیا۔ اچانک پریشانی کا حل سنتے ہی وہ شخص بے حد شکر گزار ہوا۔ ایک ماہ تک وہ کشمیر کی طرف ٹینٹ بھجواتا رہا۔

اس دوران ام راشد نے اپنے آرمی کے عزیز سے رابطہ کیا تو اس کے آرڈر بھی شروع ہو گئے۔

اس طرح کے بہت سے واقعات پیش آتے رہے ہیں اللہ پر بھروسہ مزید بڑھ جاتا ہے۔

ہماری ماہانہ میٹنگ میں ام راشد اکثر یہ بات کہتی ہیں ''جب گاؤں کے کاموں کے لیے نکلیں تو اللہ کا ذکر کثرت سے کرتے رہیں پھر دیکھیں اس کی مدد کتنی جلدی پہنچتی

ہے۔''

ایک دلچسپ ملاقات

بریڈفورڈ شہر (انگلستان) میں کافی زیادہ پاکستانی رہتے ہیں۔ 1996ء اور 1997ء میں اسی شہر کے قریب اویس بیٹے کو اچھی نوکری ملی ہوئی تھی۔ مگر اس نے ابھی تک گھر نہ لیا تھا کیونکہ اس کے لیے ممکن نہ تھا کہ صبح سے شام تک حلال روزی کمائے اور پھر گھر بھی سنبھالے۔ لہٰذا کچھ عرصہ تو وہ میری سہیلی شیرین حسین کے گھر ایک کمرے میں مہمان رہا، پھر بیٹے کے اصرار پر مجھے وہاں جانا پڑا۔ جو گھر اویس نے کرایہ پر لیا وہ اتفاق سے اسلامک سینٹر کی عمارت سے دس منٹ کے فاصلے پر تھا۔

اچھا موقع تھا وہاں کی خواتین کو قرآنی آیات اور اسماء الحسنٰی کے روحانی اثرات بتانے کیلئے۔ یہ تو ربِ کریم کی مہربانی ہوتی ہے کہ وہ ہماری بتائی ہوئی بات میں مثبت اثرات پیدا کر دیتا ہے۔ رفتہ رفتہ اس شہر میں میری کافی دوستیاں ہو گئیں۔ گلاسکو شہر کی دیندار خواتین سے تو میری پرانی دوستی ہے۔ ڈاکٹر ذکاء اسی شہر کے باہر دفن ہیں۔ جب بھی برطانیہ جانا ہوتا ہے۔ ان کی آخری آرام گاہ پر دعا کیلئے ضرور جاتی ہوں۔

گلاسکو میں اسلامک مشن کی سربراہ بہن مسرت شبیر سے کافی دوستی ہے۔ بلکہ اب تو وہ پورے برطانیہ کی ناظمہ ہیں۔ ایک مرتبہ انہوں نے مجھے کہا کہ جب بھی بریڈفورڈ جانا ہو بہن نسیم طارق سے ضرور ملاقات کریں وہ شہر سے باہر رہتی ہیں۔ میں نے انشاءاللہ تعالیٰ کہا۔

کچھ ہی عرصہ بعد بہن نسیم طارق سے ملاقات کا پروگرام بن گیا۔ وہ بریڈفورڈ کے پاس ایک چھوٹے شہر کیتھلے کے قریب ایک بہت بڑے فارم ہاؤس میں اپنے کنبہ کے ساتھ رہتی ہیں۔ باغوں میں گھرا ہوا۔ نہایت خوبصورت گھر ہے۔ قرب و جوار میں پہاڑیاں اور انواع و اقسام کے درخت پودے قدرت کا بہترین شاہکار ہیں۔ نسیم طارق کو اللہ نور السموات والارض نے چند سال پہلے شعوری ایمان کی دولت عطا کی۔ وہ حکومت کے سکول میں معلّمہ کے فرائض انجام دیتی ہیں اور باقی وقت اللہ کی راہ میں صرف کرتی ہیں۔

میرے ساتھ بریڈفورڈ سے آپا کشور محمود اور ان کی بیٹی فوزیہ بھی ملاقات کی غرض سے آئی تھیں۔ نسیم طارق کی حویلی رائیڈنگ گیٹ (Ryding gate) پہنچے تو عصر کا وقت تھا، نماز ہم گھر سے ادا کرنے کے بعد روانہ ہوئے تھے اور مغرب کی نماز گھر واپس آ کر پڑھنی تھی۔ اگست کا مہینہ تھا جب دن کافی لمبے ہوتے ہیں اس لیے ہمارا اندازہ تھا کہ بات چیت کیلئے بہت وقت ہوگا۔

نہایت دلچسپ گفتگو شروع ہو گئی۔ میں نے نسیم بہن سے اور پھر انہوں نے مجھ سے زندگی میں اس تبدیلی کے محرکات دریافت کیے..... چائے کے دوران جب ہماری میزبان نے چائے نہیں پی تو معلوم ہوا کہ وہ بے شعوری کی زندگی کے قضا روزے رکھتی ہیں جب بھی موقع ملے.....

ہمارے ایک سوال پر کہ وہ ''یو کے اسلامک مشن'' میں کیسے شامل ہوئیں؟ مسز نسیم طارق نے جلدی جلدی اپنے ماضی قریب کے تجربات بیان کرنا شروع کر دیے۔ جب سے ان کے دل میں روشنی کی کرن نے جنم لیا تھا، علم حقیقی سیکھنے اور دین کی آگاہی حاصل کرنے کے راستے کھلتے چلے گئے تھے اور وہ اس منزل کی طرف اکیلے ہی سفر کرنے میں مشغول ہوگئیں۔

اسی دوران اُن کی ایک عراقی خاتون سے دوستی ہوگئی۔ اس سے قرآن پاک کی اصلاح ہوئی۔ عربی سیکھی تو ترجمہ سمجھنا آسان ہوگیا۔ ساتھ ہی ساتھ دوسروں کو بتانے کے مواقع بھی نکلتے آئے۔

انھوں نے بتایا وہ گورنمنٹ اسکول میں معلّمہ ہیں۔ ڈیوٹی سے فارغ ہوکر جو بچیاں مقصدِ حیات سمجھنا چاہتی ہیں، انھیں دین کی ضروری باتیں نہایت ہمدردی و محبت سے بتاتی ہیں۔

پچھلے سال ان کے شہر میں ''یو کے اسلامک مشن'' کی خواتین نے ''اسلام کے بنیادی اصول'' پر ایک اجتماع کیا جو انھیں بہت پسند آیا۔ اسی روز ممبر بننے کا شوق ظاہر کیا۔ بہت سی خواتین سے دوستی ہوگئی اور اب ان کو دعوت دین کے کام میں مزید لطف آنے لگا، یونکہ صلاح مشوروں کے لیے نئی ساتھی مل گئی تھیں۔

ہماری باتیں تو ابھی نامکمل ہی تھیں، مگر وقت ختم ہوگیا۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ ہم لوگ مدتوں سے ایک دوسرے کو جانتی ہیں۔ سچ ہے کہ جو راہِ حق کے متلاشی ہوتے ہیں، اُن سب کی داستان ایک سی ہوتی ہے۔

اچھی محفل میں وقت گزرنے کا پتہ ہی نہیں چلتا۔ گھڑی پر نظر پڑی تو سورج غروب ہونے میں صرف آدھا گھنٹہ باقی تھا۔ ہم نے اجازت لینا چاہی۔ ہماری میزبان نے وعدہ لیا کہ آئندہ سال گرمیوں میں ان کے ہاں پورے دن کا پروگرام رکھیں گے۔

اللہ کے فضل سے یہ وعدہ کافی سالوں سے پورا ہو رہا ہے۔ جولائی کی آخری اتوار کو ان کے ہاں روحانی پکنک کا سا سماں ہوتا ہے۔ صبح گیارہ سے ڈیڑھ بجے تک گھر کے باہر باغ میں ہماری محفل جمتی ہے۔ جس میں شرکت کیلئے دور دور سے خواتین آتی ہیں۔ جو قریب رہتی ہیں وہ اپنے ساتھ کچھ کھانے پینے کا سامان بھی لاتی ہیں کیونکہ دوپہر کے کھانے اور نماز کیلئے گھنٹہ بھر کا وقفہ ہوتا ہے۔

ڈھائی بجے سے ساڑھے چار تک کا پروگرام گھر کے اندر منتقل ہوجاتا ہے۔ اس وقت باہر کی فضا سرد ہوجاتی ہے۔ اس دوسرے سیشن کی بات چیت میں مہمان بہنیں اپنا حصہ ڈالتی ہیں۔ دعا کی ذمہ داری مجھے نبھانی ہوتی ہے۔ اس پورے دن کے دلچسپ پروگرام کے بعد ایسے محسوس ہوتا ہے۔ جیسے روح کو تازہ ہوا کے جھونکے میسر آئے ہیں اور دل سرور سے لبریز ہوگیا ہے۔ غرض کہ یہ ہم سب کے لیے ایک یادگار دن ہوتا ہے!

بہن نسیم طارق سے خوب دوستی ہوچکی ہے۔ لاہور میں ان کی والدہ اور بہن بھائی رہتے ہیں جب بھی یہاں آتی ہیں، ہماری میٹنگ میں شامل ہوتی ہیں۔ گاؤں کے کام بہت

شوق سے دیکھنے جاتی ہیں اور مالی امداد میں بھی خوب حصہ ڈالتی ہیں۔اب ان کی والدہ فوت ہوچکی ہیں ہماری دعا ہے اللہ تعالیٰ انہیں بلند درجات عطا کرے اور ان کی اولاد کو صدقہ جاریہ کے طور پر قبول فرمالے۔(آمین)

راہِ حق کا سفر

1982ء میں لاہور شہر کی تعلیم یافتہ دیندار خواتین نے ایک تنظیم بنائی جس کا نام پاک انجمن خواتین اسلام تھا۔ مقصد دین اسلام کی نشرواشاعت اور عوام الناس میں آگاہی پیدا کرنا تھا۔بیگم نجمہ جہانگیر خان، بیگم نجم منور علی، آپا نثار فاطمہ اور بیگم مظہر الٰہی اس کی عہدیدار تھیں۔اب یہ سب خواتین اگلے جہاں کو رخصت ہوچکی ہیں جبکہ تنظیم کے ممبران میں محترمہ خورشید نیازی، ڈاکٹر طاہرہ صدیق، نسرین غلام قادر، مسز تحسین قاضی اور میرے جیسی چند اور خواتین بھی شامل تھیں۔

ان دنوں میرا زیادہ وقت گھر میں گزرتا تھا عصر کے بعد سورہ محمد اور سورہ فتح پڑھا کرتی تھی۔

1983ء میں پاک انجمن نے بین الاقوامی خواتین کانفرنس کا اسلام آباد میں بندوبست کیا۔صدر ضیاء الحق کا دور تھا ہر قسم کے انتظامات نہایت عمدہ تھے۔مجھے بھی شرکت کا موقع ملا۔رات اسلام آباد ہی میں گزارنی تھی۔آپا نعیمہ اور محترمہ خورشید نیازی کے ساتھ اسی موقع پر خوب دوستی ہوگئی۔

پاک انجمن نے لڑکیوں کا ہائی اسکول شروع کیا اور کچی آبادی میں ڈسپنسری بھی جو ابھی تک کامیابی کے ساتھ چل رہے ہیں۔

میری دلچسپی دیہات میں کام کرنے میں تھی اس لیے ہم تینوں خواتین نے کوٹ جہانگیر خان میں میڈیکل کیمپ لگانا شروع کردیا۔

ان دنوں فاطمہ جناح میڈیکل کالج کی میری سہیلیاں پروفیسر یا ایسوسی ایٹ پروفیسر کے عہدہ پر تھیں ان سے کبھی نہ کبھی ملاقات رہتی تھی۔ڈاکٹر سعدیٰ مقصود اور ڈاکٹر ماہ لقا رانا نے شوق ظاہر کیا۔''کیوں نہ کچھ قرآن کی تعلیم حاصل کی جائے۔اکثر ساڑھے دس سے گیارہ بجے تک لیکچرز کا وقفہ ہوتا ہے۔ثمین تم آجایا کرو۔'' یہ ڈاکٹر سعدیٰ کے الفاظ تھے۔

تھوڑا سوچ کر جواب دیا۔''اگرچہ میں عالمہ تو نہیں ہوں مگر جتنا سیکھا ہے اس قدر بتانا میری خوش نصیبی ہوگی۔''

اس طرح ہفتہ میں ایک دن کمیونٹی میڈیسن کے ایک کمرہ میں بیس منٹ کا سبق پڑھتے اور پندرہ منٹ باہمی بات چیت اور چائے ہوتی۔سب کو یہ محفل بہت پسند تھی جو بھی ڈاکٹرز اس وقت فرصت پاتیں شامل ہو جاتی تھیں۔نگہت، (ڈاکٹر ساجدہ عبداللہ کی بھانجی) بھی بہت شوق سے باتیں سنتیں۔

میرے لیے بھی فائدہ مند تھا گھر میں توجہ سے تیاری کرتی اور وہاں اچھی محفل میں پرانی سہیلیوں سے ملاقات بھی ہوجاتی۔

بس شیطان کو یہ اچھا پروگرام پسند نہ آیا۔کوئی عجیب سا فتنہ کھڑا ہوا اور یہ سلسلہ بند ہوگیا۔

1984ء میں ایک پرانی سہیلی ڈاکٹر خالدہ جاوید کا فون

آیا۔''میرے ہاں فاطمہ جناح کی ڈاکٹرز کا لنچ ہے تم ضرور شامل ہونا۔'' میرا جواب تھا''لنچ سے پہلے دس منٹ ایک قرآنی آیت اور دعا پروگرام میں رکھو گے تو آؤں گی۔''

اس نے جواب دیا''ہاں ضرور بلکہ تم نے ہی بتانا ہے۔'' ہمیشہ میرے دل میں یہ بات کھٹکتی تھی اگر کسی جگہ اکٹھے ہوں میڈیکل کی باتیں سوشل باتیں ہوں مگر دین کی کوئی بات بھی نہ ہو۔

مجھے آج تک یاد ہے .....سورۃ البقرہ کی آیت نمبر 152 پڑھی جس کا ترجمہ ہے''پس یاد کرو تم مجھ کو میں تم کو یاد رکھوں گا۔اور میری نعمت کی شکرگزاری کرو اور میری ناسپاسی مت کرو۔''

اس لنچ گروپ کی ابتدا ڈاکٹر تسنیم عامر رضا نے کی کلاس فیلوز سے رابطہ رکھنے کے لیے زیادہ تر ان کی ہم جماعت یا ایک سال جونیئر اور ایک سال سینئر ڈاکٹرز ہیں۔

اسی گروپ سے ایسی ڈاکٹرز تیار ہوئیں جنھوں نے مریضوں کے لیے فری ٹائم دینا شروع کیا۔

1985ء میں برطانیہ اور امریکہ کی سیر

جب ہم پاکستان شفٹ ہو رہے تھے تو اویس اور عائشہ مجھ سے اکثر پوچھا کرتے تھے۔''آپ ہمیں سکاٹ لینڈ پھر کبھی دکھائیں گی۔''تو ہمیشہ انھیں مثبت جواب دیتی تھی۔

چند سالوں میں دونوں یہاں کے سکولوں میں اچھے سیٹ ہو گئے بلکہ کلاس میں پوزیشن بھی لیتے تھے۔ اللہ کا کروڑ بار شکر ہے کبھی ٹیوشن کی ضرورت نہ پڑی۔

1985ء میں گرمیوں کی چھٹیاں پاکستان سے باہر گزارنے کا پروگرام بنا۔ چھوٹا بھائی ڈاکٹر اظہر مجید ان دنوں اپنی فیملی کے ساتھ کیلیفورنیا کے شہر لاس اینجلس (Los Angles) میں رہائش پذیر تھے۔ان کے پرزور اصرار پر پہلے امریکہ جانے کا پروگرام بنا۔ رمضان المبارک جولائی میں تھا روزے بھی ان کے ہاں رکھے۔ دونوں میاں بیوی نے بے حد خاطر مدارت کی سیریں کرائیں اور شاپنگ بھی اپنے پاس سے کرائی۔

اگست کا مہینہ برطانیہ میں گزارا۔ پہلے چند روز بھائی آصف کے پاس لندن رکے۔ اگلے دو ہفتہ کے لیے گاڑی کرایہ پر لی۔ میرے پاس برطانیہ کا گاڑی چلانے والا لائیسنس تھا اس لیے کوئی دقت نہ ہوئی۔اویس بڑی سمجھداری کے ساتھ راستہ بتاتا تھا۔اس نے ایف ایس سی کا امتحان دیا ہوا تھا۔

سکاٹ لینڈ میں ہماری میزبان مسز فرخندہ ریاض مبارک تھیں ان دنوں ان کی بڑی بیٹی مسز روحی طارق بھی لاہور سے گلاسگو والدین کے پاس گرمیاں گزارنے آئی تھیں۔دونوں نے مل کر بے اندازہ خاطر و مدارت کی۔

بہت سی پرانی سہیلیوں نے دعوتیں کیں۔ان میں مسز رشیدہ خورشید، مسز شمیم اعظم اور مسز اشرف اور ڈاکٹر نیلوفر خان پیش پیش تھیں۔

اتنی دلچسپ چھٹیاں گزارنے کے بعد تازہ دم ہو کر ہم تینوں پھر سے لاہور میں اپنے کاموں میں مصروف ہو گئے۔

اویس بیٹے نے لاہور یو-ای-ٹی یونیورسٹی میں الیکٹرک

انجینئرنگ میں داخلہ لیا تھا۔اس سے وعدہ کیا تھا وہ اچھے نمبروں سے پاس کرے تو اس کو مزید تعلیم کے لیے باہر بھیجوں گی۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل وکرم سے وعدہ پورا کرادیا۔اس نے نہایت اعلیٰ نمبروں سے بی- ایس-سی کا امتحان پاس کیا تھا۔ امریکہ میں یو- ایس- سی (یونیورسٹی آف سدرن کیلیفورنیا) سے ایم- ایس- سی کر لی تو میگل یونیورسٹی(Mcgill University Montreal) میں پی ایچ ڈی میں داخلہ ہوگیا۔

مانٹریال کینیڈا کا سفر

دسمبر 1991ءاور جنوری 1992ءمیں چھ ہفتوں کے لیے اویس سے ملنے مانٹریال گئے اس شہر میں شدید سردی پڑتی ہے۔ برفانی ہوائیں چلتی ہیں۔زیرزمین ایک پورا شہر آباد ہے جو کہ قابل دید ہے۔

کینیڈا سے واپسی پر چند روز لندن بھائی آصف کے پاس رکے۔ وہاں اسلامک مشن کے پروگراموں میں شامل ہونے کا موقع ملا۔

لندن میں ساؤتھ ہال کے علاقہ میں ایک اجتماع میں سورہ الم نشرح کی تشریح بتانے کی سعادت حاصل ہوئی۔ سب کو اچھا لگا مگر مسز زاہدہ اشفاق تو اتنی متاثر ہوئیں کہ میرے ساتھ اکیلے پندرہ بیس منٹ اس موضوع پر گفتگو کرتی رہیں.....ان سے دوستی پکی ہوگئی۔پچھلے سالوں میں مسز زاہدہ اشفاق اور ان کی نومسلم سہیلی صائمہ نے کونسلنگ کے کورس لندن یونیورسٹی کے ایک شعبہ سے کیے ہیں اور اس طرح وہ ڈیپریشن (Depression) میں مبتلا پریشان حال خواتین کی خدمت کررہی ہیں۔

1991ء ماہ جولائی میں والد صاحب انتقال کر گئے۔ نہایت مخلص انسان تھے۔اولاد کی تربیت میں بہت محنت کی اور پھر اگلی نسل کو بھی اچھی باتیں بتایا کرتے تھے۔نانا جان کی صحبت میرے دونوں بچوں کو پسند تھی۔خاص طور پر انھیں اپنی گاڑی میں گھر لے کر آتی تاکہ کچھ خدمت کا موقع ملے۔ اویس اور عائشہ کو علامہ اقبال کے اشعار زبانی یاد کراتے اور تشریح بیان کرتے۔ اللہ تعالیٰ انھیں بلند درجات عطا کرے۔

1993ء کا سال اویس بیٹے نے لاہور میں گزارا۔ پنجاب کالج میں لیکچرر کی سروس مل گئی تھی مگر سال پورا کرتے ہی اسے لندن میں ایک جاب مل گئی۔اس دوران عائشہ بیٹی کا میڈیکل میں داخلہ ہو چکا تھا وہ اپنی پڑھائی میں مصروف ہوگئی تھی۔

(جاری ہے)

❁❁❁

شازیہ مشتاق

کچن کارنر

گولہ کباب

اجزا: قیمہ 1000 گرام، گھی تھوڑا سا، دھنیا 20 گرام ، پیاز 250 گرام ، پہاڑی نمک 20 گرام سرخ مرچ 20 گرام، ادرک 1 ٹکڑا، دہی حسب ضرورت۔

ترکیب: پیاز اور ادرک پیس لیں دھنیا، نمک اور سرخ مرچ کو پانی کے ساتھ پیس لیں اس کے بعد ادرک، پیاز اور پسا ہوا مصالحہ قیمے میں ملا کر اچھی طرح مکس کر لیں اس مرکب میں تھوڑا سا گھی بھی ملا دیجئے اب ان کو لمبوترے کبابوں کی شکل میں سیخ پر لگا کر کوئلوں پر سرخ کر لیں اور سلاد کے ساتھ پیش کریں۔

بہاری کباب

اجزا: گائے کے گوشت کے پسندے ½ کلو، ادرک 1 انچ کا ٹکڑا، گرم مصالحہ (پسا ہوا) 2 چائے کے چمچ ، ہری مرچیں 8 عدد، دہی 1 پیالی، کچری 6 عدد، نمک حسب ذائقہ، سرسوں کا تیل ½ پیالی۔

ترکیب: سب سے پہلے تمام مصالحوں کو پیس لیں پسندوں کو اچھی طرح پیس کر نمک اور سرسوں کا تیل لگا دیں درمیانی سائز کی پسی ہوئی پیاز اس میں شامل کریں۔ اچھی طرح مکس کریں اب ادرک، گرم مصالحہ، مرچیں، کچری اور دہی شامل کر لیں۔ اور تقریباً 5 سے 8 گھنٹے تک پڑا رہنے دیں اس کے بعد سیخ پر چڑھا کر دھاگے کے ساتھ باندھیں حسب خواہش کوئلے یا گیس پر پکائیں جب سرخ ہو جائے تو گھی لگا کر مزید پکائیں اور سلاد اور رائتہ کے ساتھ پیش کریں۔

دھواں کباب

اجزا: قیمہ آدھا کلو، دہی 4 کھانے کے چمچ، انڈا 1 عدد، پیاز 1 عدد (تلی ہوئی) ، بیسن آدھا کپ (بھنا ہوا) ، سبز مرچیں باریک پسی ہوئی 3 عدد، نمک حسب ضرورت، سرخ مرچ 1 چمچ، گرم مصالحہ 1 کھانے کا چمچ، تیل یا گھی حسب ضرورت۔

ترکیب: قیمے کو چاپر میں چوپ کر لیں پیاز تل کر پیس لیں اس میں پیاز، لہسن، بیسن اور تمام مصالحہ جات ڈال کر ہاتھ سے مکس کر لیں انڈا بھی ملا لیں اب اس کو بھون لیں جب قیمہ بھن جائے تو روٹی کا ایک ٹکڑا لیں یا پھر ایک ڈبل روٹی کا سلائس لیں کوئلے کو دہکا کر اس روٹی یا سلائس پر رکھیں اوپر تھوڑا سا گھی ڈالیں اور جلدی سے ڈھکن بند کر دیں 15 منٹ بعد ڈھکن اٹھائیں اور قیمے کی درمیانہ سائز کی ٹکیا بنا کر تل لیں۔

کھٹا میٹھا گوشت

اجزا: گوشت آدھا کلو، پیاز 4 عدد، لہسن 10 جوئے ،

ادرک ایک درمیانہ ٹکڑا، سبز مرچ 5 عدد، ٹماٹر 2 عدد، گاجر 1 پاؤ، سفید تل آدھا چھٹا نک، چینی آدھا پاؤ، میدہ 5 کھانے کے چمچ کھوپرا (بھنا ہوا) آدھی چھٹا نک، نمک حسب ذائقہ، لال مرچ 2 چائے کے چمچ، گھی 1 کپ، اجوائن (بھنی ہوئی) ایک چٹکی، املی کا پانی آدھا کپ۔

ترکیب: لہسن، ٹماٹر، اجوائن، کھوپرا، نمک پیس لیں پیاز، گاجر اور سبز مرچ کتر لیں اب یہ تمام چیزیں مکس کر کے گوشت پر لگا لیں اور آدھے گھنٹے کے لئے رکھ دیں گھی میں پیاز براؤن سرخ کر کے تل لیں اور نکال کر کسی ڈش پر اخبار رکھ کر پھیلا دیں اب اس گھی میں گوشت تل لیں جب گوشت کا پانی خشک ہو جائے تو اس میں سرخ مرچ ڈال کر بھون لیں اب اس میں ایک پیالی پانی ڈال دیں اب میدے کو ہلکا سا بھون کر اس میں 4 کپ پانی، املی کا پانی اور چینی ملا کر گوشت میں ڈال دیں اور پکنے دیں جب پانی آدھا رہ جائے اور گوشت گل جائے تو گاجر اور سبز مرچ بھی تل کر اس میں شامل کر دیں۔ جب گوشت گھی چھوڑنے لگے تو اسے Dish out کر لیں اوپر براؤن کی ہوئی پیاز اور باقی کھوپرا اور تل تھوڑا سا کچل کر چھڑک دیں اور چاولوں کے ساتھ پیش کریں۔

ہری مرچ کا رائتہ

اجزا: ہری مرچ ½ پاؤ، دہی 1 پاؤ، نمک حسب ذائقہ، لیموں 1 عدد، سفید زیرہ ایک چمچ، آئسنگ شوگر 1 چمچ۔

ترکیب: اوپر والی تمام چیزیں بلینڈر میں ڈالیں لیموں کا رس نکال کر ڈال دیں اب تھوڑا سا پانی ڈال کر بلینڈر کر لیں اور پیالے میں نکال لیں۔ رائتہ تیار ہے۔

انڈوں کا حلوہ

اجزا: انڈے 1 درجن، چینی ڈیڑھ پاؤ، گھی آدھا پاؤ، سبز الائچی 5 عدد کشمش، بادام، پستہ، گری ایک پاؤ، دودھ آدھا کلو، زعفران ایک چٹکی، زردا رنگ ایک چٹکی، کیوڑہ چند قطرے۔

ترکیب: تمام انڈے کسی پیالے میں توڑ لیں اور یکجان کر لیں اب پین میں دودھ ڈالیں گرم کریں جب دودھ ابلنے لگے تو اس میں چینی شامل کر دیں اب اس میں انڈوں کا آمیزہ اور گھی بھی شامل کر دیں آنچ درمیانی رکھیں جب دودھ خشک ہو جائے اور حلوہ گھی چھوڑنے لگے تو اس میں کیوڑہ، زعفران اور زردا رنگ گھول کر شامل کر دیں اور تمام میوہ جات بھی اسے آپ صبح کے ناشتے میں بریڈ کے ساتھ استعمال کر سکتے ہیں۔

زردہ

اجزا: چاول آدھا کلو، زردا رنگ 2 چمچ، کیوڑہ پانی 1 چمچ، کھوپرا ½ چھٹا نک، چینی 2 پیالی، چھوٹی الائچی 5 عدد، کھویا 1 پاؤ، تیل 3 چمچ، اشرفیاں (پیٹھے کی مٹھائی) 1 پاؤ۔

ترکیب: چاول بھگو کر رکھ دیں دیگچی میں 3 چمچ تیل ڈالیں۔ اس میں الائچی ڈال کر کڑکڑا لیں 4 پیالی پانی ڈالیں اور چینی ڈال دیں جب شیرا بن جائے یعنی پانی کو اُبال آ جائے تو چاول ڈال دیں۔ اب کیوڑہ میں زردا رنگ گھول کر شامل کر دیں جب پانی خشک ہو جائے تو کھوپرا، کھویا، اشرفیاں اور بادام، پستہ ڈال کر دم پر رکھ دیں۔ ☆☆☆